سولہ ۱۶ دلکش نتیجہ خیز قصّوں کا مجموعہ

خاکِ پروانہ

منشی پریم چند

ناشر

آزاد بک ڈپو امرتسر

باجازت
سید شریف حسین صاحب سہروردی مالک گیلانی بکڈپو لاہور

قیمت :- Rs. 15/-

نیو لیتھو آرٹ پریس دھلی ۶

فہرست

خاکِ پروانہ

(۱)

آہ! بدقسمت میں! میرے شامتِ اعمال نے آج یہ دن دکھائے کہ ذلّت بھی میرے اُوپر ہنستی ہے۔ اور یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں کیا۔ شیطان کے سر الزام کیوں دُوں۔ قسمت کو کیوں صلواتیں سُناؤں۔ شُدنی کو کیوں روؤں جو کچھ میں نے دیدہ دانستہ کیا۔ ابھی ایک سال گذرا جب میں خوش نصیب تھا۔ اقبال میرا خادم اور ثروت میری کنیز تھی دُنیا کی نعمتیں میرے روبرو دست بستہ حاضر تھیں لیکن آج رسوائی اور نکبت اور شرمندگی میرے حال زار پر افسوس کرتی ہے۔ میں عالی خاندان تھا اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ۔ فارسی کا مُلّا۔ سنسکرت کا پنڈت۔ انگریزی کا گریجویٹ۔ اپنے مُنہ میاں مِٹھو کیا بنوں لیکن حُسنِ ظاہر سے مجھے قابلِ رشک حصّہ ملا تھا۔ غرض ایک انسان کو خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے برکات کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ وُہ سب مجھے حاصل تھیں۔ صحت کا یہ حال کہ مجھے کبھی سردرد کی بھی شکائیت نہیں ہوئی۔ فلِٹن کی سیر۔ دریا کی دلفریبیاں۔ کہسار کے نظارے۔ ان شادمانیوں کا ذکر ہی تکلیف دہ ہے

کیا عیش اور مسرت کی زندگی تھی!

آہ! یہاں تک تو اپنا دردِ دل سنا سکتا ہوں لیکن اس کے آگے پھر مُہرِ خاموشی لگی ہوئی ہے۔ ایک عصمت مآب وفا شعار اور شوہر پرست بیوی اور وہ خوبصورت گلاب کے پھول سے بچے انسان کے لیے جن خوشبوؤں آرزوؤں حوصلوں اور دلفریبیوں کے مخزن ہو سکتے ہیں۔ ان کا ذکر تحصیل ہے۔ میں اس قابل نہیں کہ اس پاکیزہ صفت خاتون کا نام زبان پر لاؤں۔ میں اس قابل نہیں کہ اپنے تئیں اُن لڑکوں کا باپ کہہ سکوں۔ مگر میرے نصیب میں نے اُن بہشتی نعمتوں کی قدر نہ کی۔ جس عورت نے میرے حکم اور اپنی خواہش میں کبھی امتیاز نہ کیا۔ جو باوجود میری لاابالیوں کے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی۔ جس کا غصہ کبھی آنکھوں سے آگے نہ بڑھنے پایا یا غصہ کیا تھا۔ کنوار کی برکھا تھی۔ دو چار ہلکی ہلکی بوندیں گریں اور پھر آسمان صاف ہو گیا۔ اپنے نشۂ دیوانگی میں میں نے اس دیوی کی قدر نہ کی۔ میں نے اُسے جلایا۔ رُلایا۔ تڑپایا۔ میں نے اس کے ساتھ دغا کی۔ آہ! جب میں دو دو بجے رات کو گھر لوٹتا تھا۔ تو مجھے کیسے کیسے بہانے سُوجھتے تھے۔ نت نئے حیلے گھڑتا تھا۔ شاید طالب علمی کے زمانہ میں جب بیٹھک کی دلفریبیاں مدرسہ جانے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ اس وقت بھی ذہن رسا نہ تھا۔ اور کیا اس عفت کی دیوی کو میری باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ وہ بھولی تھی۔ مگر ایسی سادہ لوح نہ تھی۔ میری پُر خمار آنکھیں اور میرے سطحی جذبات اور میرے مصنوعی اظہارِ محبت کا راز کیا اس سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی تھی۔ کوئی کمینہ خیال اس کی زبان پر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ان باتوں کا ذکر کر کے یا اپنے شکوک کا اعلانیہ اظہار کر کے ہمارے پاکیزہ تعلقات میں کشیدگی یا بدمزگی پیدا کرنا حد درجہ نامناسب سمجھتی تھی۔ مجھے اس کے خیالات اس کی پیشانی پر لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان بدمزگیوں کے مقابلے میں اُسے جلنا اور رونا زیادہ پسند تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ میرا نشہ خود بخود اُتر جائے گا۔ کاش اس شرافت کے

بدلے اسے کچھ کم ظرفی اور اوچھے پن میں دخل ہوتا۔ کاش وہ اپنے حقوق کو اپنے ہاتھ میں رکھنا جانتی۔ کاش وہ اتنی غریب اور بے غیرت نہ ہوتی۔ کاش وہ اپنے اندرونی جذبات کو چھپانے میں اتنی مشاق نہ ہوتی۔ کاش وہ اتنی مکار نہ ہوتی لیکن میری مکاری اور اس کی مکاری میں کتنا تفاوت تھا۔ میری مکاری حرام کاری تھی۔ اس کی مکاری نفس کشی اور قربانی تھی۔

ایک روز میں اپنے کام سے فرصت پا کر شام کے وقت تفریح کے لیے آنند باڑکا میں جا پہنچا اور سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ کر مچھلیوں کی خوش فعلیوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ دفعتہً نگاہ اٹھی تو میں نے ایک عورت کو بیلے کی جھاڑیوں میں پھول چنتے دیکھا اس کے کپڑے میلے تھے۔ اور بجز عالم شباب کی تازگی اور غرور کے اس چہرے میں کوئی خاص صفت نہ تھی اس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور پھر اپنے پھول چننے میں مصروف ہو گئی۔ گویا اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس کے اس انداز نے خواہ وہ سادگی ہی کیوں نہ ہو میری آتشِ شوق کو تیز کیا۔ میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ کوئی عورت یوں دیکھے گویا اس نے نہیں دیکھا۔ میں اٹھا اور آہستہ آہستہ کبھی زمین اور کبھی آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بیلے کی جھاڑیوں کے پاس جا کر خود بھی پھول چننے لگا۔ اس جسارت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالن کی لڑکی وہاں سے تیزی کے ساتھ باغ کے دوسرے حصہ میں چلی گئی۔

اس دن سے معلوم نہیں وہ کونسی کشش تھی جو مجھے روز شام کے وقت آنند باڑکا کی طرف کھینچ لے جاتی۔ یہ محبت ہرگز نہیں تھی۔ اگر مجھے اس وقت خدانخواستہ اس دوشیزہ کی بابت کوئی المناک خبر ملتی تو شاید میری آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلتے۔ جوگیا بھیس لینے کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ میں روز جاتا اور نئے نئے روپ بھر کر جاتا۔ لیکن جس قدرت نے مجھے اچھے خط و خال دیئے تھے۔ اسی نے مجھے چرب زبانی سے محروم رکھا تھا۔ میں روز جاتا افسوس لوٹ آتا۔ منزلِ عشق میں ایک قدم بھی طے نہ ہوتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہو گیا

کر اسے پہلی سی جھجک نہ رہی۔

آخر اس خاموشانہ پالیسی کو سرسبز نہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ ایک روز میں اپنے ساتھ اپنے غریب بل ڈاگ ٹامی کو بھی لیتا گیا۔ جب شام ہو گئی اور وہ غارتگر صبر و تشکیب پھولوں سے دامن بھر کر اپنے مکان کی طرف چلی تو میں نے اپنے بل ڈاگ کو آہستہ سے اشارہ کر دیا۔ بل ڈاگ اس کی طرف بال کی طرح جھپٹا۔ پھول متی نے ایک چیخ ماری۔ دو چار قدم دوڑی اور تب زمین پر گر پڑی۔ اب میں چھڑی ہاتھ میں ہلاتا بل ڈاگ کی طرف خشمناک نگاہوں سے دیکھتا اور ہائیں ہائیں چلاتا ہوا دوڑا اور اسے زور سے دو تین ڈنڈے لگائے۔ پھر میں نے بکھرے ہوئے پھولوں کو سمیٹا سہمی ہوئی عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ اور بہت ندامت آمیز اور افسوسناک انداز سے بولا "یہ کتا بڑا بدمعاش ہے۔ اب اسے اپنے ساتھ کبھی نہ لاؤں گا۔ تمہیں اس نے کاٹ تو نہیں لیا؟"

پھول متی نے چادر سے سر کو ڈھانکتے ہوئے کہا۔ تم نہ آ جاتے تو وہ مجھے نوچ ڈالتا۔ میرے تو جیسے من من بھر کے پیر ہو گئے تھے۔ میرا کلیجہ ابھی تک دھڑک رہا ہے۔

یہ نشانہ تیر بہدف ثابت ہوا۔ خموشی کی مہر ٹوٹ گئی۔ حرف و شکایت کا سلسلہ قائم ہوا۔ باندھ میں ایک شگاف ہو جانے کی دیر تھی۔ پھر تو نفس کی لہروں نے خود بخود عمل کرنا شروع کیا۔ میں نے جیسے جیسے جال پھیلائے جیسے جیسے سوانگ بھرے وہ رنگین طبع اصحاب خوب جانتے ہیں۔ اور یہ سب کیوں؟ محبت سے نہیں صرف ذرا دیر دل کو خوش کرنے کیلئے صرف اس کے گداز جسم اور بھولے پن پر۔ یہ کچھ کرتا یوں میں بہت ادنےٰ مذاق کا انسان نہیں ہوں۔ شکل و شباہت میں پھول متی کا اندو سے مقابلہ نہ تھا۔ وہ حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ شعرا نے حسن کے جو معیار قائم کر رکھے ہیں وہ سب وہاں نظر آتے تھے لیکن نامعلوم کیوں میں نے پھول متی کی گھسی ہوئی آنکھوں اور چوسے ہوئے رخساروں اور موٹے موٹے

ہونٹوں کی طرف اپنے دل کا زیادہ کھچاؤ دیکھا۔ آمد و رفت زیادہ ہوئی اور ہفتہ بھر بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ میں اس کا بندۂ محبت بن بیٹھا۔ مجھے اب گھر کی سادہ زندگی میں کوئی لطف نہ آتا تھا۔ لیکن جوں جوں گھر سے بیزار ہوتا تھا توں توں بیوی کی ظاہر داری اور خاطر داری زیادہ کرتا تھا۔ میں اس کی فرمائشوں کا منتظر رہتا اور کبھی اس کا دل دکھانے والا کلمہ میری زبان پر نہ آتا۔ شاید میں اپنی اندرونی بے التفاتی کو ظاہرداری کے پردہ میں چھپانا چاہتا تھا۔

رفتہ رفتہ دل کی یہ کیفیت بھی متغیر ہوئی۔ اور بیوی کی طرف سے افسردگی اور بے تعلقی کا اظہار ہونے لگا۔ گھر میں کپڑے نہیں ہیں۔ لیکن مجھے دریافت حال کی توفیق نہ ہوتی۔ حق یہ ہے کہ مجھے اب اس کی خاطر داری کرتے ہوئے ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اس کی خاموشی کی دیوار منہدم نہ ہو جائے اور اس کے اندرونی جذبات زبان پر نہ آ جائیں۔ یہاں تک کہ میں نے صریح خانگی ضروریات کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

اب میرا دل اور جان اور مال و زر سب پھول متی کے لئے وقف تھا۔ میں خود کبھی زرگر کی دکان پر نہ گیا تھا۔ لیکن آج کل کوئی مجھے پیر راستہ کے ایک مشہور سنار کے مکان پر بیٹھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ بزازہ کی دکان بھی میرے لئے دلچسپی کا باعث بن گئی۔

(۲)

ایک روز شام کے وقت اپنے حسب معمول میں آنند باٹیکا میں محو سیر تھا اور پھول متی سولھوں سنگار کئے میرے ساتھ اور سنہرے حاشیہ سے لدی ہوئی ایک ریشمی ساری زیب تن کئے باغ کے روشوں میں پھول توڑ رہی تھی۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنی چٹکیوں میں میرے دل کو مسل رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس وقت نشۂ حسن سے پھیل گئی تھیں اور ان میں شوخی و تبسم کی جھلک نظر آتی تھی۔

دفعتہً مہاراجہ صاحب بھی اپنے چند احباب کے ساتھ موٹر پر سوار آپہنچے میں انہیں دیکھتے ہی پیشوائی کے لئے دوڑا اور آداب بجالایا۔ غریب پھول متی مہاراجہ صاحب کو پہچانتی تھی۔ لیکن اُسے بجز ایک گھنے کنج کے اور کوئی چھپنے کی جگہ نہ مل سکی۔ مہاراجہ صاحب چلے تو حوض کی طرف۔ لیکن میری نحوست اور شومئ تقدیر انہیں اسی روش پہ لے چلی جدھر پھول متی چھپی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مہاراجہ صاحب نے اس کی جانب تعجب سے دیکھا اور بولے یہ کون عورت ہے؟

سب لوگ میری طرف پُرسوال نگاہوں سے تاکنے لگے اور مجھے بھی اس وقت یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کا جواب میں ہی دوں ورنہ پھول متی نہ جانے کیا آفت ڈھائے۔ ایک انداز لاپرواہی سے بولا۔ "اسی باغ کے مالی کی لڑکی ہے۔ یہاں پھول توڑنے آئی ہوگی"۔

پھول متی شرم اور خوف کے مارے زمین میں دھنسی جاتی تھی۔ مہاراجہ صاحب نے اُسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور تب شُبہ آمیز انداز سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ یہ مالی کی لڑکی ہے؟

میں اس کا جواب کیا دیتا۔ اسی اثنا میں کم بخت مالی بھی اپنی پھٹی ہوئی پاگ سنبھالتا۔ ہاتھ میں کدال لئے دوڑتا ہوا آیا اور سر کو گھٹنوں سے ملا کر تعظیم بجالایا۔

مہاراج نے ذرا تیز لہجہ میں پوچھا۔ یہ تیری لڑکی ہے؟

مالی کے ہوش اُڑ گئے۔ کانپتا ہوا بولا ہجور۔

مہاراج۔ تیری تنخواہ کیا ہے؟

کُندن۔ ہجور پانچ روپے۔

مہاراج۔ یہ لڑکی کنواری ہے یا بیاہی؟

کُندن۔ ہجور ابھی کنواری ہے۔

مہاراج نے خشمناک ہو کر کہا یا تو چوری کرتا ہے یا ڈاکہ ڈالتا ہے۔ ورنہ یہ کبھی نہیں

ہو سکتا کہ تیری لڑکی امیر زادی بن کر رہ سکے مجھے ابھی وقت اس کا جواب دینا ہو گا ورنہ میں تجھے پولیس کے سپرد کر دوں گا۔ ایسے چال چلن کے آدمی کو میں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔

مالی کی تو گھگھی بندھ گئی اور میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دنیا نظروں میں تاریک معلوم ہوتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ آج میری شامت سر پر سوار ہے وہ مجھے بیخ و بن سے اکھاڑ کر تب دم لے گی۔ مہاراجہ صاحب نے مالی کو زور سے ڈانٹ کر پوچھا۔ تو خاموش کیوں ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟

دُرجن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب ذرا آواز سنبھلی تو بولا۔ حضور! باپ دادے سے سرکار کا نمک کھاتا ہوں۔ اب میرے بڑھاپے پر دیا کیجئے۔ یہ سب میرے پھوٹے نصیبوں کا کھیل ہے۔ دھرما وتار! اس چھوکری نے میری ناک کٹوا دی۔ کُل کا نام مٹا دیا۔ اب میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ اس کو سب طرح سمجھا بجھا کر ہار گئے لیکن میری باتوں کو سُنتی ہی نہیں تو کیا کروں حضور! ماں باپ ہیں۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ اسے اب امیروں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ اور آج کل کے رئیسوں اور امیروں کا کیا کہوں۔ دین بندھو سب جانتے ہیں۔

مہاراجہ صاحب نے ذرا دیر غور کر کے پوچھا۔ کیا اس کا کسی سرکاری ملازم سے تعلق ہے؟

دُرجن نے سر جھکا کر کہا۔ حضور۔

مہاراجہ صاحب۔ وہ کون آدمی ہے۔ تمہیں اسے بتلانا ہوگا۔

دُرجن۔ مہاراج جب پوچھیں گے بتا دوں گا۔ سانچ کو آنچ نہیں۔

میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید اسی وقت سارا راز طشت از بام ہوا جاتا ہے لیکن مہاراجہ صاحب نے اپنے دربار کے کسی ملازم کی عزت کو اس طرح مٹی میں ملانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے حوض کے پاس آئے اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے ساتھ لئے ہوئے موٹر پر بیٹھ کر محل کی طرف چلے۔

(۳)

اس منحوس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد ایک روز میں دربار سے لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں

سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر میں کھٹکا۔ اُس کے چہرہ پر وہ بناوٹی بھولاپن تھا۔ جو کٹنیوں کے چہرہ کی نمایاں صفت ہے میں نے اُسے ڈانٹ کر پوچھا۔ تو کون ہے؟ یہاں کیوں آئی تھی؟

بڑھیا نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر میری بلائیں لیں اور بولی بیٹا ناراض نہ ہو غریب بھکارنی ہوں۔ مالکن کا سہاگ بھرپور ہے۔ اُسے جیسا سُنتی تھی ویسا ہی پایا۔

یہ کہہ کر اُس نے تیزی سے قدم اُٹھائے اور باہر چلی گئی میرے غصے کی حرارت بڑھی۔ میں نے گھر جا کر پوچھا۔ یہ کون عورت آئی تھی؟

میری بیوی نے سر جھکائے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ کیا جانوں۔ کوئی بھکارنی تھی۔ میں نے کہا بھکارنیوں کی صورت ایسی نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو مجھے کٹنی سی لگتی ہے۔ صاف صاف بتاؤ۔ اس کے یہاں آنے کا کیا مطلب تھا؟

لیکن بجائے اس کے کہ ان شبہ آمیز باتوں کو سُن کر میری بیوی غرور سے سر اُٹھائے اور میری طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر اپنی صاف دلی کا ثبوت دے اُس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ میں اس کے پیٹ میں تھوڑے ہی بیٹھی تھی۔ بھیک مانگنے آئی تھی بھیک لے گئی۔ کسی کے دل کا حال کوئی کیا جانے؟

اس کے لہجہ اور انداز سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ جتنا زبان سے کہتی ہے اس سے بہت زیادہ اس کے دل میں ہے۔ اس فن میں وہ ابھی نومشق تھی۔ ورنہ تریا چرتر کی تھاہ کیسے ملتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں تھرتھرا رہے ہیں۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے سر کو اوپر اُٹھا کر نہایت متین غصے سے بولا۔ اندرا تم جانتی ہو کہ مجھے تمہارا کتنا اعتبار ہے لیکن اگر تم نے اسی وقت سارا واقعہ بے کم و کاست نہ بیان کیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تمہارا انداز بتاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ یہ خوب سمجھ رکھو کہ میں اپنی عزت کو تمہاری اور اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ میرے لیے ڈوب مرنے

کی جگہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے اس قسم کی باتیں کروں۔ اس کی جانب سے میرے دل میں بدگمانی پیدا ہو گئی ہے مجھے اب زیادہ صبر کی گنجائش نہیں ہے۔ بولو کیا بات تھی؟

اندومتی میرے پاؤں پر گر پڑی اور رو کر بولی۔ میرا قصور معاف کرو۔

میں نے گرج کر کہا وہ کونسا قصور ہے؟

اندومتی نے سنبھل کر جواب دیا۔ تم اپنے دل میں اس وقت جو خیال کر رہے ہو۔ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں مت رہنے دو۔ ورنہ سمجھ لو کہ آج ہی اس زندگی کا خاتمہ ہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میری طرف سے ایسے خیال رکھتے ہو۔ میرا پریتما جانتا ہے کہ تم نے میرے اوپر جو ظلم کئے ہیں۔ انہیں میں نے کس طرح برداشت کیا ہے۔ اور اب بھی سب کچھ سہنے کیلئے تیار ہوں۔ میرا سر تمہارے پیروں پر ہے جس طرح رکھو گے رہونگی۔ لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ تم جیسے خود ہو۔ ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہو۔ مجھ سے خطا ضرور ہوئی ہے لیکن اس غلطی کی یہ سزا نہیں کہ تم مجھ پر ایسے شک کرو۔ میں نے اس عورت کی باتوں میں آ کر اس سے اپنے گھر کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے لیکن کچھ تو اس عورت کی ہمدردی اور کچھ میرے اندر سلگتی ہوئی آگ نے مجھ سے یہ حماقت کروائی اور اس کے لئے تم جو سزا دو۔ وہ میرے سر اور آنکھوں پر ہے۔

میرا غصہ ذرا دھیما ہوا۔ بولا تم نے اس سے کیا کہا؟

اندومتی نے جواب دیا۔ گھر کا جو کچھ حال ہے۔ تمہاری بیوفائی تمہاری لاپرواہی تمہارا گھر کی ضروریات کی فکر نہ رکھنا۔ اپنی بیوفائی کو کیا کہوں۔ میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ ادھر تین مہینہ سے انہوں نے گھر کیلئے کچھ خرچ بھی نہیں دیا اور اس کا وبال میرے زیوروں پر پڑا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ان تین مہینوں میں میرے ساڑھے چار سو روپے کے زیور بک گئے نہ معلوم کہاں۔ میں اس سے یہ سب کچھ کہہ گئی جب انسان کا دل جلتا ہے تو زبان تک آنچ آ ہی جاتی ہے۔ اگر مجھ سے بھی کچھ خطا ہوئی تو اس سے کئی گنا سخت سزا تم نے مجھے دی۔ میرا ایمان لینے کا بھی صبر نہ ہوا۔ خیر

تمہارے دل کی کیفیت مجھے معلوم ہو گئی۔ تمہارا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے تمہیں مجھ پر وشواس نہیں رہا۔ ورنہ ایک بھکاری عورت کے گھر سے نکلنے پر تمہیں ایسے شبہ کیوں ہوتے ہیں میں سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا معلوم ہو گیا کہ تباہی کے سامان پورے ہوئے جاتے ہیں۔

(۴)

دوسرے دن میں جوں ہی دفتر پہنچا۔ چوبدار نے آکر کہا۔ مہاراجہ صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ میں تو اپنی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی سے کئے بیٹھا تھا۔ میں خوب سمجھ گیا تھا کہ وہ بڑھیا خفیہ پولیس کی کوئی مخبر ہے جو میرے خانگی حالات کی تحقیقات کے لئے تعینات ہوئی ہو گی کل ہی اس کی رپورٹ آئی ہو گی اور آج میری طلبی ہے۔ خوف سے سہما ہوا لیکن دل کو بزور سنبھالے ہوئے کہ جو کچھ سر پر پڑے گی دیکھا جائے گا۔ ابھی سے کیوں جان کھوؤں۔ میں مہاراجہ صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا وہ اس وقت اپنے پوجا کے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ کاغذوں کا ایک دفتر ادھر ادھر پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ خود کسی خیال میں محو تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔ ان کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آئے۔ بولے کنور شیام سنگھ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہاری بابت مجھے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مجھے اس امر پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ تم میرے پرانے وثیقہ دار ہو۔ اور تمہیں یہ اعزاز کئی پشتوں سے حاصل ہے۔ تمہارے بزرگوں نے ہمارے خاندان کی جانبازانہ خدمات کی ہیں۔ اور انہیں کے صلہ میں یہ وثیقہ عطا ہوا تھا۔ لیکن تم نے اپنی حرکات سے اپنے تئیں اس عنایت کا مستحق نہیں رکھا۔ تمہیں اس لئے وثیقہ ملتا تھا کہ تم اپنے خاندان کی پرورش کرو۔ اپنے لڑکوں کو اس قابل بناؤ کہ وہ راج کی کچھ خدمت کر سکیں۔ انہیں اخلاقی اور جسمانی تعلیم دو۔ تاکہ تمہارے وجود سے ریاست کی بھلائی ہو۔ نہ کہ اس لئے کہ تم اس روپیہ کو بیہودہ عیش پرستی اور حرامکاری میں صرف کر دو۔ مجھے یہ بہت شاق گزرتا ہے کہ تم نے اب اپنے اہل و عیال کی پرورش

سے بھی اپنے تئیں سبکدوش کر لیا ہے۔ اگر تمہارا یہی وطیرہ رہا تو یقیناً وثیقہ داروں کا ایک پرانا خاندان مٹ جائیگا۔ اس لئے آج سے ہم نے تمہارا نام وثیقہ داروں کی فہرست سے خارج کر دیا، اور تمہارے بجائے تمہاری بیوی کا نام درج کیا گیا وہ اپنے لڑکوں کی پرورش و پرداخت کی ذمہ دار ہے۔ تمہارا نام ریاست کے مالیوں کی فہرست میں لکھا جائے۔ تم نے اپنے کو اسی نوازش کا اہل ثابت کیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ تبادلہ تمہیں ناگوار نہ ہوگا۔ بس جائیے۔ اور ممکن ہو تو اپنے فعلوں پہ پچھتائیے۔

(۵)

مجھے کچھ عرض معروض کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے بہت استقلال کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ سنا اور گھر کی طرف چلا۔ لیکن دو چار قدم ہی چلا تھا کہ معاً خیال آیا۔ کس کے گھر جا رہے ہو؟ تمہارا گھر اب کہاں ہے۔ میں اُلٹے قدم لوٹا۔ جس گھر میں بادشاہ تھا، وہاں دوسروں کا دست نگر بن کر مجھ سے نہیں رہا جائیگا۔ اور رہا بھی جائے تو مجھے نہیں رہنا چاہیئے۔ میرے اعمال ناشائستہ ضرور تھے لیکن میرا اخلاقی احساس اس قدر زائل نہیں ہوا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس وقت اس شہر سے بھاگ جانا مناسب ہے ورنہ بات پھیلتے ہی ہمدردوں اور بدخواہوں کا ایک جمگھٹ اظہار حال کے لئے آ جائیگا۔ دوسروں کی خشک ہمدردیاں سہنی پڑیں گی۔ جن کے پردے میں خوشی جھلکتی ہوگی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے پھول متی کا خیال آیا۔ اس کے کارن یہ سب دُرگت ہو رہی ہے۔ اسی سے تو مل ہی لوں۔ مگر دل نے روکا۔ کیا ایک صاحب ثروت رئیس کی جو عزت ہوتی تھی وہ مجھے اب حاصل ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بازارِ حسن میں وفا اور محبت سے مال و زر زیادہ گراں بہا جنس ہے۔ ممکن ہے اس وقت مجھ پر ترس کھا کر یا ایک عارضی جوش میں پھول متی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن اُسے لے کر کہاں جاؤں گا۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر چلنا تو اور بھی مشکل ہے۔ اس طرح سوچ کر میں نے بمبئی کی

راہ لی۔ اور اب دو سال سے ایک مِل میں ملازم ہوں۔ تنخواہ صرف اتنی ہے کہ قالب اور روح میں مفارقت نہ ہونے پائے۔ لیکن ایشور کا شکر کرتا ہوں اور اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ مَیں ایک دفعہ پوشیدہ طور پر وطن گیا تھا۔ پچھلی مٹی نے ایک دوسرے رئیس سے حُسن کا سودا کر لیا ہے۔ لیکن میری بیوی نے اپنے حُسنِ انتظام سے گھر کی حالت خوب سنبھالی ہے۔ مَیں نے اپنے مکان کو رات کے وقت مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ دروازہ پر دو لالٹینیں روشن تھیں۔ اور بچے اِدھر اُدھر کھیل رہے تھے صفائی اور سلیقہ کا جلوہ نظر آتا تھا۔ مجھے اخباروں کے دیکھنے سے معلوم ہُوا۔ کہ مہینوں تک میرے پتہ نشان کے متعلق اخباروں میں اشتہار شائع ہوتے رہے لیکن اب یہ صورت لے کر مَیں پھر وہاں کیا جاؤں گا۔ اور یہ رُوئے سیاہ کس کو دکھاؤں گا۔ اب تو مجھے اسی خستہ حالی میں زندگی کے دن کاٹنے ہیں۔ رو کر یا ہنس کر میرا اختیار ہے۔ مَیں اپنے حرکات پر اب بہت نادم ہُوں۔ افسوس! مَیں نے اُن نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اُنہیں لات سے ٹھوکر ماری۔ یہ اسی کی سزا ہے۔ کہ آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ مَیں وہ پروانہ ہُوں۔ جس کی خاک بھی بادِ صبا کے جھونکوں سے نہ بچی۔

نادان دوست

(۱)

کیشو کے گھر میں ایک کارنس کے اُوپر ایک چڑیا نے انڈے دیے تھے۔ کیشو اور اُس کی بہن شیاما دونوں بڑے غور سے چڑیا کو وہاں آتے جاتے دیکھا کرتے سویرے دونوں آنکھیں ملتے کارنس کے سامنے پہنچ جاتے اور چڑا اور چڑیا دونوں کو وہاں بیٹھا پاتے اُن کو دیکھنے میں دونوں بچّوں کو نہ معلوم کیا مزہ ملتا تھا۔ دودھ اور جلیبی کی بھی سُدھ نہ رہتی تھی۔ دونوں کے دل میں طرح طرح کے سوال اُٹھتے انڈے کتنے بڑے ہونگے؟ کس رنگ کے ہوں گے؟ کیا کھاتے ہوں گے۔ ان میں سے بچے کس طرح نکل آئیں گے۔ بچّوں کے پر کیسے نکلیں گے۔ گھونسلا کیسا ہے؟ لیکن اِن باتوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ نہ امّاں کو گھر کے کام دھندوں سے فرصت تھی نہ بابوجی کو پڑھنے لکھنے سے۔ دونوں بچے آپس ہی میں سوال جواب کرکے اپنے دِل کو تسلّی دے لیا کرتے تھے۔

شیاما کہتی۔ "کیوں بھیّا! بچے نکل کر پُھر سے اُڑ جائیں گے؟"

کیشو عالمانہ غرور سے کہتا۔ "نہیں ری پگلی پہلے پر نکلیں گے۔ بغیر پروں کے بچارے کیسے اُڑیں گے؟"

شیاما۔ "بچّوں کو کیا کھلائے گی بچاری؟"

کیشو اِس پیچیدہ سوال کا جواب کچھ نہ دے سکتا تھا۔

اس طرح تین چار دن گذر گئے دونوں بچوں کی خواہش تحقیق دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ انڈوں کو دیکھنے کے لئے وہ بیتاب ہوئے اٹھتے تھے انہوں نے قیاس کیا۔

"اب ضرور بچے نکل آئے ہونگے۔ بچوں کے چارے کا سوال اب ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ چڑیا بیچاری اتنا دانہ کہاں پائے گی۔ کہ سارے بچوں کا پیٹ بھرے۔ غریب بچے بھوک کے مارے چوں چوں کر کے مر جائیں گے۔

اس مصیبت کا اندازہ کر کے دونوں گھبرا اٹھے دونوں نے فیصلہ کیا کہ کارنس پر تھوڑا سا دانہ رکھ دیا جائے۔ شیاما خوش ہو کر بولی۔ "تب تو چڑیوں کو چارے کے لئے کہیں آنا جانا نہ پڑے گا؟"

کیشو۔ "نہیں۔ تب کیوں جائیں گی"

شیاما۔ کیوں بھیا! بچوں کو دھوپ نہ لگتی ہوگی؟

کیشو کا دھیان اس تکلیف کی طرف نہ گیا تھا۔ یقینا ضرور تکلیف ہو رہی ہوگی؟ کیا پیاس کے مارے تڑپتے ہوں گے۔ اوپر سایہ بھی تو کوئی نہیں۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ گھونسلے کے اوپر کپڑے کی چھت بنا دینی چاہیئے پانی کی پیالی اور تھوڑے سے چاول رکھ دینے کی تجویز بھی منظور ہو گئی۔

دونوں بچے بڑے شوق سے کام کرنے لگے۔ شیاما ماتا کی آنکھ بچا کر مٹکے سے چاول نکال لائی۔ کیشو نے پتھر کی پیالی کا تیل چپکے سے زمین پر گرا دیا اور اسے خوب صاف کر کے اس میں پانی بھرا۔

اب چاندنی کے لئے کپڑا کہاں سے آئے پھر اوپر بغیر چھڑیوں کے کپڑا ٹھہرے گا کیسے اور چھڑیاں کھڑی ہونگی کیسے؟ کیشو بڑی دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا آخر کار اس نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ شیاما سے بولا۔ "جا کر کوڑا پھینکنے والی ٹوکری اٹھا لاؤ۔ اماں جی کو مت دکھانا

شیاما۔ "وہ تو بیچ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس میں سے دھوپ نہ جائے گی؟"

کیشو نے جھنجھلا کر کہا۔ "تو ٹوکری تو لا۔ میں اِس کا سوراخ بند کرنے کی کوئی حکمت نکالوں گا۔"
شیاما دوڑ کر ٹوکری اُٹھا لائی۔ کیشو نے اس کے سوراخ میں تھوڑا سا کاغذ ٹھونس دیا۔ اور تب ٹوکری کو ایک ٹہنی سے ٹکا کر بولا۔
"دیکھ! ایسے ہی گھونسلے پر اسکی آڑ کر دوں گا۔ تب کیسے دھوپ جائے گی؟"
شیاما نے دل میں سوچا۔ بھیّا کتنے چالاک ہیں!

(۲)

گرمی کے دن تھے بابوجی دفتر گئے ہوئے تھے۔ ماتا دونوں بچوں کو کمرے میں سُلا کر خود سو گئی تھی۔ لیکن بچوں کی آنکھوں میں آج نیند کہاں۔ اماں جی کو بہلانے کیلئے دونوں دم روکے آنکھیں بند کئے موقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جُوں ہی معلوم ہُوا کہ اماں جی اچھی طرح سو گئیں۔ دونوں چپکے سے اُٹھے اور بہت آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر نکل آئے۔ انڈوں کی حفاظت کی تیاریاں ہونے لگیں۔
کیشو کمرے سے ایک سٹول اُٹھا لایا۔ لیکن جب اُس سے کام نہ چلا تو نہانے کی چوکی لا کر سٹول کے نیچے رکھی اور ڈرتے ڈرتے سٹول پر چڑھا۔
شیاما دونوں ہاتھوں سے سٹول پکڑے ہوئے تھی۔ سٹول چاروں ٹانگیں برابر نہ ہونے کے باعث جس طرف زیادہ دباؤ پڑتا تھا۔ ذرا سا ہِل جاتا تھا۔ اس وقت کیشو کو کس قدر تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔ یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے کارنس پکڑ لیتا اور شیاما کو دبی آواز سے ڈانٹتا۔ "اچھی طرح پکڑ۔ ورنہ اُتر کر بہت ماروں گا۔" مگر بچاری شیاما کا دل تو اوپر کارنس پر تھا بار بار اُس کا دھیان اُدھر چلا جاتا اور ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے۔ کیشو نے جونہی کارنس پر ہاتھ رکھا دونوں چڑیاں اُڑ گئیں۔ کیشو نے دیکھا کارنس پر تھوڑے تنکے بچھے ہوئے ہیں۔ اور اس پر تین انڈے پڑے ہیں جیسے گھونسلے اس نے درختوں پر دیکھے تھے ایسا کوئی گھونسلا نہیں ہے۔ شیاما نے نیچے سے پُوچھا "کے بچے ہیں بھیّا!"

کیشو۔ تین انڈے ہیں۔ ابھی بچے نہیں نکلے۔

شیاما۔ ذرا ہمیں دکھا دو۔ بھیا کتنے بڑے ہیں؟

کیشو۔ دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا چیتھڑے لے آ۔ نیچے بچھا دوں۔ بچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں۔

شیاما دوڑ کر اپنی پرانی دھوتی پھاڑ کر ایک ٹکڑا لائی۔ کیشو نے جھک کر کپڑا لے لیا۔ اس کے کئی تہہ کر کے اس نے ایک گدی بنائی اور اسے تنکوں پر بچھا کر تینوں انڈے آہستہ سے اس پر رکھ دیئے۔

شیاما نے پھر کہا۔ "ہم کو بھی دکھا دو بھیا؟

کیشو۔ دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا وہ ٹوکری تو دے دو۔ اوپر سایہ کر دوں۔ شیاما نے ٹوکری نیچے سے تھما دی اور بولی "اب تم اتر آؤ۔ میں بھی تو دیکھوں۔ کیشو نے ٹوکری کو ایک ٹہنی سے لگا کر کہا "جا دانہ اور پانی کی پیالی لے آ۔ میں اتر آؤں تو تجھے دکھاؤں گا۔"

شیاما پیالی اور چاول بھی لائی۔

کیشو نے ٹوکری کے نیچے دونوں چیزیں رکھ دیں اور آہستہ سے اتر آیا۔

شیاما نے گڑگڑا کر کہا۔ "اب ہم کو بھی چڑھا دو بھیا!

کیشو۔ تو گر پڑے گی۔

شیاما۔ "نہ گروں گی بھیا۔ تم نیچے سے پکڑے رہنا۔"

کیشو۔ "نہ بھیا۔ کہیں تو گر گرا پڑے تو اماں جی میری چٹنی ہی کر ڈالیں۔ کہیں کہ تو نے ہی چڑھایا تھا۔ کیا کرے گی دیکھ کر؟ اب انڈے بڑے آرام سے ہیں جب بچے نکلینگے تو ان کو پالیں گے۔"

دونوں پرندے بار بار کارنس پر آتے تھے اور بغیر بیٹھے ہی اڑ جاتے تھے۔ کیشو

نے سوچا۔ ہم لوگوں کے ڈر سے نہیں بیٹھتے۔ سٹول اُٹھا کر کمرے میں رکھ آیا۔ چوکی جہاں کی تھی۔ وہاں رکھ دی۔

شیاما نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "تم نے مجھے نہیں دکھایا۔ میں اماں جی سے کہہ دوں گی۔"

کیشو۔ اماں جی سے کہے گی تو بہت ماروں گا۔ کہے دیتا ہوں۔

شیاما۔ تو تم نے مجھے دکھایا کیوں نہیں۔؟

کیشو۔ اور گر پڑتی تو چار سر نہ ہو جاتے؟

شیاما۔ ہو جاتے ہو جاتے۔ دیکھ لینا۔ میں کہہ دوں گی۔

اتنے میں کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ماتا نے دھوپ سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں باہر کب نکل آئے؟ میں نے کہا تھا کہ دوپہر کو نہ نکلنا! کس نے کواڑ کھولا۔"

کواڑ کیشو نے کھولا تھا۔ لیکن شیاما نے ماتا سے یہ بات نہیں کہی اُسے خوف تھا کہ بھیا پٹ جائیں گے۔ کیشو دل میں کانپ رہا تھا کہ کہیں شیاما کہہ نہ دے انڈے نہ دکھلائے تھے۔ اس سے اب اس کو شیاما پر اعتبار نہ تھا۔ شیاما صرف محبت کے مارے چپ تھی۔ یا اس قصور میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید دونوں ہی باتیں تھیں۔

ماتا نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پھر کمرے میں بند کر دیا اور آپ آہستہ آہستہ انہیں پنکھا جھلنے لگی۔ ابھی صرف دو بجے تھے۔ باہر تیز لو چل رہی تھی۔ اب دونوں بچوں کو نیند آ گئی تھی۔

(۳)

چار بجے یکایک شیاما کی نیند کھلی۔ کواڑ کھلے ہوئے تھے وہ دوڑی ہوئی کارنس

کے پاس آئی اور اوپر کی طرف تاکنے لگی۔ ٹوکری کا پتہ نہ تھا۔ اتفاقاً اس کی نگاہ نیچے گئی اور وہ اُلٹے پاؤں دوڑتی ہوئی کمرے میں جاکر زور سے بولی۔

"بھیا! انڈے تو نیچے پڑے ہیں۔ بچے اُڑ گئے!"

کیشو گھبرا کر اٹھا اور دوڑتا ہوا باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ تینوں انڈے نیچے ٹوٹے پڑے ہیں۔ اور ان سے کوئی چونے کی سی چیز باہر نکل آئی ہے۔ پانی کی پیالی بھی ایک طرف ٹوٹی پڑی ہے۔

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

شیاما نے پوچھا "بچے کہاں اُڑ گئے بھیا؟"

کیشو نے افسوسناک لہجہ میں کہا۔ "انڈے تو پھوٹ گئے"

"اور بچے کہاں گئے؟"

کیشو "تیرے سر میں دیکھتی نہیں ہے۔ انڈوں میں سے اُجلا اُجلا پانی نکل آیا ہے۔ وہی تو دو چار دن میں بچے بن جاتے!"

ماتا نے سوئی ہاتھ میں لئے ہوئے پوچھا۔ "تم دونوں وہاں دھوپ میں کیا کر رہے ہو؟"

شیاما نے کہا۔ "اماں جی چڑیا کے انڈے ٹوٹے پڑے ہیں"

ماتا نے آکر ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا اور غصہ سے بولی۔ "تم لوگوں نے انڈوں کو چھوا ہوگا؟"

اب تو شیاما کو بھیا پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اسی نے شاید انڈوں کو اس طرح رکھ دیا کہ وہ نیچے گر پڑے۔ اس کی اسے سزا ملنی چاہیئے۔ بولی۔

"انہوں نے انڈوں کو چھیڑا تھا اماں جی!"

ماتا نے کیشو سے پوچھا۔ "کیوں رے؟" کیشو بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

ماتا۔ "تو وہاں پہنچا کیسے؟"

شیاما۔ "چوکی پر سٹول رکھ کر چڑھے تھے اماں جی!"

کیشو۔ "تو سٹول تھامے نہیں کھڑی تھی؟"

شیاما۔ "تم ہی نے تو کہا تھا۔"

ماتا۔ "تو اتنا بڑا ہوا ہے تجھے ابھی اتنا بھی نہیں معلوم کہ چھونے سے چڑیوں کے انڈے گندے ہو جاتے ہیں۔ چڑیا پھر انہیں نہیں سیتی۔"

شیاما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تو کیا چڑیا نے انڈے گرا دیئے ہیں۔ اماں جی؟"

ماتا۔ "اور کیا کرتی۔ کیشو کے سر اس کا پاپ پڑے گا۔ ہا! ہا! ہا! تین جانیں لے لیں دُشٹ نے۔"

کیشو رونی صورت بنا کر بولا:-

"میں نے تو صرف انڈوں کو گدی پر رکھ دیا تھا اماں جی!"

ماتا کو ہنسی آ گئی۔

مگر کیشو کو کئی دنوں تک اپنی غلطی پر افسوس ہوتا رہا۔ انڈوں کی حفاظت کرنے کے زعم میں اس نے ان کا ستیاناس کر ڈالا۔ اسے یاد کر کے وہ کبھی کبھی رو پڑتا تھا

دونوں چڑیاں وہاں پھر نہ دکھائی دیں۔

نغمۂ رُوح

(۱)

آدھی رات ندی کا کنارا۔ آسمان کے تارے ساکن تھے۔ ندی کے تلاطم لہروں کے ساتھ رعناں۔ ایک نغمۂ فردوس کی دلکش رُوح پرور مستانہ صدائیں اس خاموش اور تاریک منظر پر اس طرح چھا رہی تھیں جیسے عل پر اُمیدیں چھائی رہتی ہیں یا چہرہ پر غم۔

رانی منورما نے آج گوردھن کی سالی تھی۔ سارے دن دان اور برت میں مصروف رہنے کے بعد میٹھی نیند کی گود میں سو رہی تھی دفعتہً آنکھیں کھلیں اور یہ دلکش صدائیں کانوں میں پہنچیں۔ بے قرار ہو گئی جیسے پروانہ شمع دیکھ کر صبر کی تاب نہ رہی جیسے چیونٹی شکر کی بُو پاتے ہی بیتاب ہو جاتی ہے۔ اُٹھی اور دربانوں چوکیداروں کی نگاہیں بچاتی ہوئی راج محل سے باہر نکل آئی جیسے نالۂ درد سُن کر آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔

ساحل پر خار دار جھاڑیاں تھیں اُونچے کو نگارے تھے۔ خوفناک جانور تھے اُن کی ہیبت ناک صدائیں تھیں۔ لاشیں تھیں اور اُن سے زیادہ ان کا خیال تھا۔ منورما ناز و نزاکت کی پُتلی تھی۔ پُر نغمۂ شیریں کی کشش اُسے ایک عالمِ محویت میں کھینچے لئے جاتی تھی۔ خطروں سے بے خبر۔

وُہ گھنٹوں سرگرم رفتار رہی۔ یہاں تک کہ ندی راستہ میں حائل ہو گئی۔

(۲)

منورما نے بے بسی کے ساتھ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کنارے پر ایک کشتی نظر آئی۔

مانجھی سے بولی۔ میں اُس پار جاؤنگی۔ اِس دِلکش راگ نے مجھے بیتاب کر دیا ہے۔

مانجھی۔ رات کو ناؤ نہیں کھول سکتا۔ ہوا تیز ہے۔ لہریں ڈراؤنی جان جوکھم ہے۔

منورما۔ میں رانی منورما ہوں۔ ناؤ کھول دے۔ مُنہ مانگی مزدوری دُوں گی۔

مانجھی۔ تب تو ناؤ کسی طرح نہیں کھول سکتا۔ رانیوں کا اس ندی میں گزارہ نہیں۔

منورما۔ چودھری تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ جلد ناؤ کھول دے۔ میری روح اِس طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔

مانجھی۔ کیا انعام ملے گا؟

منورما۔ جو تو مانگے۔

مانجھی۔ آپ ہی کہہ دیں۔ میں گنوار کیا جانوں۔ رانیوں سے کیا چیز مانگنی چاہیئے کہیں کوئی ایسی چیز نہ مانگ بیٹھوں۔ جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔

منورما۔ میرا یہ ہار نہایت بیش قیمت ہے۔ میں اس کھیوے میں دیتی ہوں۔

منورما نے گلے سے ہار نکالا۔ اس کی ضیاء سے مانجھی کا چہرہ روشن ہو گیا۔ تُند اور کرخت۔ جس پر ایک مُدت دراز کی سیاہی نے جھریاں ڈال دی تھیں۔

دفعتہً منورما کو ایسا معلوم ہوا کہ نغمہ کی صدا قریب تر ہو گئی۔ شاید کوئی عارف اپنی خودمستی کے عروج میں اس ساحل پر بیٹھا ہوا فضا تاریک کو مترنم کر رہا ہے۔ رانی کا سینہ اُچھلنے لگا۔ آہ کتنا دلسوز نغمہ تھا اس نے بے صبر ہو کر کہا۔ "مانجھی اب دیر نہ کر۔ ناؤ کھول میں ایک لمحہ بھی صبر نہیں کر سکتی۔"

مانجھی۔ اس ہار کو لے کر میں کیا کروں گا؟

منورما۔ سچے موتی ہیں۔

مانجھی۔ اور بھی مصیبت۔ مانجھن گلے میں ڈال کر پڑوسیوں کو دکھائے گی وہ سب ڈاہ سے جلیں گی۔ اُسے گالیاں دینگی۔ کوئی چور دیکھیگا تو اُسکی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگے گا۔

میری سُنسان جھونپڑی میں دِن دہاڑے ڈاکہ پڑ جائے گا۔ لوگ چوری کا اپرادھ لگائیں گے۔ نہیں مجھے یہ ہار نہیں چاہیئے۔

منورما۔ تُو جو کچھ مانگے وہی دُوں گی لیکن دیر نہ کر۔ مجھے اب صبر نہیں ہے۔ انتظار کی مطلق تاب نہیں۔ اس راگ کی ایک ایک تان میری رُوح کو تڑپائے دیتی ہے۔

مانجھی۔ اس سے اچھی کوئی چیز دیجیئے۔

منورما۔ آہ ظالم! تو مجھے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ میں جو دیتی ہوں وُہ لیتا نہیں۔ آپ کچھ مانگتا نہیں۔ تجھے کیا معلوم میرے دل کی اس وقت کیا حالت ہو رہی ہے میں اس رُوحانی نعمت پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔

مانجھی۔ آئندہ کیا دیجیئے گا۔

منورما۔ میرے پاس اس سے بیش قیمت کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن تو ابھی ناؤ کھول دے تو وعدہ کرتی ہوں۔ تجھے اپنا محل دے دُوں گی۔ جسے دیکھنے کے لئے شاید کبھی تو بھی گیا ہو۔ خالص سنگِ مرمر ہے۔ ہندوستان میں اس کا ثانی ہے نہیں۔ اب ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کر۔

مانجھی (ہنس کر) اس محل میں رہ کر مجھے کیا آرام ملے گا۔ اُلٹے میرے بھائی بند دُشمن ہو جائیں گے۔ اس ناؤ پر اندھیری رات میں بھی ڈر نہیں لگتا۔ آندھی چلتی رہتی ہے اور میں اس پر پڑا رہتا ہوں۔ لیکن وہ محل تو دن کو ہی پھاڑ کھائے گا۔ میرے گھر کے آدمی تو اس کے ایک کونے میں سما جائیں گے۔ اور آدمی کہاں سے لاؤں گا۔ میرے نوکر چاکر کہاں؟ اتنا مال اسباب کہاں؟ اسکی صفائی اور مرمت کہاں سے کراؤں گا۔ اس کی پھلواڑیاں سوکھ جائیں گی۔ اس کی کیاریوں میں گیدڑ بولیں گے۔ اور اٹاریوں پر کبوتر اور ابابیلیں گھونسلے بنائیں گی۔

منورما دفعتہً ایک عالم مستی میں اُچھل پڑی اُسے معلوم ہُوا کہ نغمہ قریب آ گیا ہے

اس کی نزاکت اور لطافت زیادہ روشن ہو گئی تھی۔ جیسے بتی اُکسا دینے سے چراغ زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ پہلے دلکش تھا تو اب ولولہ خیز ہو گیا تھا۔ منورما نے بیتاب ہو کر کہا۔ آہ تو پھر تو اپنی زبان سے کیوں کچھ نہیں مانگتا۔ اُف! اتنا معرفت انگیز راگ ہے۔ کتنا وجد میں لانے والا۔ میں اب مطلق صبر نہیں کر سکتی۔ پانی نشیب میں جانے کے لئے جتنا بے قرار ہوتا ہے۔ سانس ہوا کے لئے جتنی بے قرار ہوتی ہے۔ بُو اُڑ جانے کے لئے جتنی بے قرار ہوتی ہے۔ میں اس نغمہ کے لئے اتنی ہی بے قرار ہوں۔ اس نغمہ میں کوئل کی سی مستی ہے۔ پپیہے کا سا درد ہے۔ شیاما کا سا لطف ہے۔ اس میں آبشاروں کا زیر ہے۔ طوفان کا بم ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے۔ جس سے معرفت بیدار ہوتی ہے۔ جس سے رُوح وجد کرتی ہے جس سے قلب مرتعش ہوتا ہے۔ ماکھنی! اب ایک چھن کی دیر بھی میرے لئے عذاب موت ہے۔ جلد ناؤ کھول! جس پھول کی یہ مہک ہے۔ جس چراغ کی یہ روشنی ہے۔ اس تک مجھے پہنچا دے۔ میں دیکھ نہیں سکتی۔ اس نغمہ کا خالق کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا ہے بہت قریب۔"

ماکھنی۔ "آپ کا محل میرے کام کا نہیں ہے۔ میری جھونپڑی اس سے کہیں زیادہ سہاونی ہے۔"

منورما۔ ہائے تو اب تجھے کیا دوں۔ یہ نغمہ نہیں ہے۔ یہ اس فضاء وسیع کی زینت ہے۔ یہ سارے پھولوں کی رُوح ہے ساری شیرینیوں کا عطر ہے۔ ساری حلاوتوں کا۔ ساری کیفیتوں کا خلاصہ ہے۔ ناؤ کھول۔ میں جب تک جیوں گی تیری خدمت کروں گی۔ تیرے لئے پانی بھروں گی۔ تیرے جھونپڑے کی خاکروبی کروں گی۔ ہاں! میں تیری راہ کے کنکر چنوں گی۔ تیرے جھونپڑے کو پھولوں سے سجاؤں گی۔ تیری ماکھن کے پیر ملوں گی۔ پیاری ماکھنی! اگر میرے پاس سو جانیں ہوتیں تو میں اس نغمہ کے نذر کرتی۔ ایشور کے لئے اب مجھے مایوس نہ کر۔ میرے صبر کا آخری قطرہ خشک ہو گیا۔ اب اس اشتیاق میں

شعلہ کی سوزش اور جلن ہے اب یہ سر تیرے قدموں پر ہے۔

یہ کہتے کہتے منورما ایک جنون وجد کی حالت میں ، گجنی کے قریب جا کر اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اُسے معلوم ہوا گویا وہ نغمہ روح پرور کسی شمع روشن کی طرح نور برساتا ہوا میری طرف چلا آتا ہے۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ مست ہو کر جھومنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اُڑی جاتی ہوں اُسے اپنے پہلو میں ستارے جھلملاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس پر ایک بیخودی کا سرور چھا گیا اور تب وہی مستانہ نغمہ۔ وہی دلکش راگ اس کے منہ سے نکلنے لگا۔ وہی آبحیات کی بوندیں اس کے لبوں سے ٹپکنے لگیں۔ وہ خود اس نغمہ کا منبع تھی۔ ندی پار سے آنے والی روح پرور صدائیں اسی کے منہ سے نکل رہی تھیں۔

منورما کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہو گیا تھا۔ اور آنکھوں سے پریم کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

ستیاگرہ

ہز ایکسیلنسی وائسرے بنارس آرہے تھے۔ سرکاری اہلکار کیا چھوٹے بڑے سبھی ان کے خیر مقدم کی تیاری کر رہے تھے۔ ادھر کانگرس نے شہر میں ہڑتال کرنیکی منادی کر دی تھی جس سے اہلکاروں میں بڑی ہلچل تھی۔ ایک طرف سڑکوں پر جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ صفائی ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی شاندار محرابیں بنائی جا رہی تھیں دفاتر کی آرائشیں ہو رہی تھیں پنڈال بن رہا تھا اور دوسری طرف فوج و پولیس کے سپاہی سنگینیں چڑھائے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر قواعد کرتے پھرتے تھے۔ حکام کی سر توڑ کوشش تھی کہ ہڑتال نہ ہونے پائے مگر کانگرس والوں کو دھن تھی کہ ہڑتال ہو اور ضرور ہو۔ اگر حکام کو حیوانی طاقت پر ناز ہے تو ہمیں روحانی قوت کا بھروسہ ہے اس بار دونوں کی آزمائش ہو جائے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر صبح سے شام تک دکانداروں کو دھمکیاں دیتا پھرتا کہ ایک ایک کو جیل بھجوا دونگا۔ یہ کرونگا اور وہ کرونگا۔ دوکاندار ہاتھ جوڑ کر کہتے کہ حضور بادشاہ ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر ہم کیا کریں؟ کانگرس والے ہمیں جیتا نہ چھوڑینگے ہماری دوکانوں پر دھرنا دیں گے۔ ہمارے اوپر پیال بڑھا دینگے۔ کنوئیں میں گر ینگے فاقے کرینگے۔ کون جانے دو چار جان ہی دیدیں تو ہمارے منہ پر ہمیشہ کے لئے کالک لگ جائے گی۔ حضور! انہیں کانگرس والوں کو سمجھا دیں تو ہمارے اوپر بڑا احسان ہو۔ ہڑتال نہ کرنے سے ہمارا کچھ نقصان تھوڑا ہی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے آدمی آوینگے۔ ہماری دوکانیں کھلی رہینگی تو ایک کے دو لیں گے۔ مہنگے سودے بیچیں گے مگر کیا کریں۔ ان شیطانوں سے کوئی بس نہیں چلتا۔"

لئے ہر ممکن سہائے راجہ لال چند اور خان بہادر مولوی محمود علی تو حکام سے بھی زیادہ بے چین تھے۔ مجسٹریٹ کے ساتھ اور تنہا بھی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اپنے مکانوں پر بلا کر دوکانداروں کو سمجھاتے منت سماجت کرتے آنکھیں دکھلاتے۔ یکے بگھی والوں کو دھمکاتے مزدوروں کی خوشامد کرتے مگر کانگریس کے مٹھی بھر آدمیوں کا کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ کنجڑوں نے بھی بےخوفی سے کہہ دیا کہ حضور چاہے مار ڈالو مگر دوکان تو نہ کھلے گی۔ ناک نہ کٹواؤں گی سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ہڑتال چلنے والے مزدور بڑھئی لوہار وغیرہ کام نہ چھوڑ دیں تب تو غضب ہی ہو جائے گا۔ راجہ صاحب نے کہا۔ حضور! دوسرے شہروں سے دوکاندار بلوا دیں اور ایک بازار علیحدہ کھولیں۔

خاں صاحب نے فرمایا: وقت اتنا کہاں ہے کہ دوسرا بازار تیار ہو سکتا۔ حضور! کانگریس والوں کو گرفتار کر لیں یا ان کی جائداد ضبط کر لیں۔ پھر دیکھئے کیسے قابو میں نہیں آتے۔

راجہ صاحب بولے۔ اس داروگیر سے تو لوگ اور جھلائیں گے۔ کانگریس والوں سے حضور کہیں کہ تم ہڑتال بند کر دو۔ تو سب کو سرکاری ملازمت دے دی جائیگی۔ اس میں زیادہ تر بیکار لوگ بھرے پڑے ہیں۔ لالچ دکھلانے سے خوش ہو جائیں گے۔ مگر مجسٹریٹ کو کوئی رائے پسند نہ آئی۔ یہاں تک کہ وائسرائے کے آنے میں تین روز رہ گئے۔

(٢)

آخر راجہ صاحب کو ایک تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ ہم لوگ بھی روحانی طاقت سے کام لیں آخر کانگریس والے مذہب اور روحانی طاقت ہی کے نام پر تو یہ طومار باندھتے ہیں ہم لوگ بھی انہیں کی تقلید کریں۔ شہر کو اس کی مانند میں پچھاڑیں کوئی آدمی پیدا کرنا چاہئے۔ جو فاقے کرے کہ دوکانیں نہ کھلیں تو جان دیدونگا۔ یہ ضروری ہے کہ وہ برہمن ہو۔ اور ایسا ہو کہ جس کو شہر کے لوگ جانتے ہوں اور اس کی عزت کرتے ہوں۔ یہ بات دیگر رفقاء کے بھی دل نشین

ہو گئے۔ وہ اچھل پڑے۔ رائے صاحب نے کہا کہ بس اب میدان مار لیا۔ اچھا ایسا کون پنڈت ہے؟ پنڈت گدادھر شرما؟

راجہ۔ جی نہیں۔ اسے کون مانتا ہے؟ صرف اخبارات میں لکھا کرتا ہے شہر کے لوگ اسے کیا جانیں۔

رائے صاحب۔ دمڑی اوجھا تو ہے اسی ڈھنگ کا؟

راجہ۔ جی نہیں۔ کالج کے طلباء کے سوا اسے اور کون جانتا ہے؟

رائے صاحب۔ پنڈت موٹے رام شاستری؟

راجہ۔ بس بس آپ نے خوب سوچا۔ بے شک وہ اس ڈھنگ کا۔ اسی کو بلانا چاہیئے۔ عالم ہے۔ دھرم کرم سے رہتا ہے۔ ہوشیار بھی ہے وہ اگر ہاتھ میں آجائے تو بازی ہماری ہے۔

رائے صاحب نے فوراً پنڈت موٹے رام کے گھر پر پیغام بھیجا۔ اس وقت شاستری جی پوجا کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ پیغام پاتے ہی جلد پوجا ختم کی اور چل دیئے۔ راجہ صاحب نے بلایا ہے۔ دھنیہ بھاگ! اہلیہ سے بولے "آج چندولاں کچھ بلوان معلوم ہوتا ہے۔ کپڑے لاؤ۔ دیکھوں کیوں بلایا ہے"

اہلیہ نے کہا۔ کھانا تیار ہے۔ کھاتے جاؤ۔ نہ جانے کب لوٹنے کا موقع ملے۔

مگر شاستری جی نے آدمی کو اتنی دیر کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ جاڑے کے دن تھے۔ سبز بانات کی اچکن پہنی۔ جس پر سرخ سنجاف لگی تھی۔ گلے میں ایک ندی کا دوپٹہ ڈالا۔ سر پر بنارسی صافہ باندھا۔ سرخ چوڑے کنارے والی ریشمی دھوتی پہنی اور کھڑاؤں پر چلے۔ ان کے چہرے پر رونق برستی تھی۔ دور سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مہاتما آ رہے ہیں۔ راستے میں جو ملتا سر جھکاتا۔ کتنے ہی دکانداروں نے کھڑے ہو کر پالاگن کیا۔ آج کاشی کا نام انہیں کی دولت چل رہا ہے۔ ورنہ اور کون ہے؟ کتنے منکسر المزاج ہیں۔ بالکوں سے

ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ اس ٹھاٹھ سے پنڈت جی راجہ کے دکان پر پہنچے۔ تینوں دوستوں نے کھڑے ہو کر ان کی تعظیم کی۔ خاں صاحب بولے۔ کہئے پنڈت جی مزاج تو اچھے ہیں۔ واللہ آپ نمائش میں رکھنے کے قابل آدمی ہیں۔ آپ کا وزن تو دس من سے کم نہ ہوگا۔"

رائےصاحب۔ ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہیئے۔ اسی قاعدہ سے ایک من عقل کے لئے دس من کا جسم ضروری ہے ورنہ اس کا بوجھ کون اُٹھائے؟

راجہ صاحب۔ آپ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ عقل ایک قسم کا نشہ ہے۔ جب دماغ میں نہیں سماتی تو جسم میں آجاتی ہے۔

خانصاحب۔ ہم نے بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ موٹے آدمی عقل کے دشمن ہوتے ہیں۔

رائےصاحب۔ آپ کا حساب کمزور ہے ورنہ آپ کی سمجھ میں اتنی بات ضرور آجاتی کہ جب عقل اور جسم میں ایک اور دس کی نسبت ہے تو جتنا ہی موٹا آدمی ہوگا۔ اُتنا ہی اس کی عقل کا وزن بھی زیادہ ہوگا۔

راجہ صاحب۔ اس سے ثابت ہوا کہ جتنا ہی موٹا آدمی اُتنی ہی موٹی اس کی عقل۔

موٹے رام۔ جب موٹی عقل کی بدولت راج دربار میں پوچھ ہوتی ہے تو مجھے پتلی عقل لے کر کیا کرنا چاہیئے؟

ہنسی مذاق کے بعد راجہ صاحب نے پنڈت جی کے سامنے موجودہ مسئلہ پیش کیا اور اس کے حل کی جو تدبیر سوچی تھی وہ بھی ظاہر کی۔ بولے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس سال آپ کا مستقبل پورے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شاید کسی آدمی کو اپنی تقدیر کے فیصلہ کا ایسا اہم موقعہ نہ ملا ہوگا۔ ہڑتال اگر ہوگئی تو اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر عمر بھر کسی کے دروازے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس ایسا کوئی برت ٹھانیئے کہ شہر والے تھرا اُٹھیں۔ کانگرس والوں نے مذہب کی آڑ لے کر اتنی طاقت بڑھائی ہے۔ بس ایسی کوئی ترکیب نکالئے کہ عوام کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔

موٹے رام نے متانت سے جواب دیا۔ یہ تو کوئی ایسا کٹھن کام نہیں ہے۔ میں تو ایسے ایسے اُپائے کر سکتا ہوں کہ آسمان سے پانی برساؤں۔ مری (ہیضہ) کو بھی دُور کردُوں۔ اناج کا بھاؤ گھٹا بڑھا دوں۔ پھر کانگرس والوں کو ہرا دیا۔ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ کوئی نہیں کرسکتا۔ گر گپت (پوشیدہ) وِدیاؤں کا انہیں گیان (علم) ہی نہیں۔

خانصاحب۔ تب تو جناب یہ کہنا چاہیئے کہ آپ دوسرے خدا ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ میں یہ قدرت ہے ورنہ اتنے دِنوں تک کیوں پریشان ہوتے

موٹے رام۔ صاحب! میں چھپے دھن کا پتہ لگا سکتا ہوں۔ پتروں (آباؤاجداد) کو بُلا سکتا ہوں۔ صرف گُن کا گاہک چاہیئے۔ سنسار میں گُن والوں کی کمی نہیں ہے۔ گُن کے پارکھیوں کی کمی ہے۔ "گُن نا ہرا نو گُن گاہک ہرا نو ہے"

راجہ۔ بھلا اس انوشٹھان کے لیے آپ کو کیا بھینٹ کرنا ہوگا۔

موٹے رام۔ جو آپ کی مرضی۔

راجہ۔ راجہ کچھ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کونسا انوشٹھان ہوگا۔

موٹے رام۔ بلا بھوجن کے برت کے ساتھ منتروں کا جاپ ہوگا۔ سارے شہر میں ہلچل نہ مچادوں تو موٹے رام نام نہیں۔

راجہ۔ تو پھر کب سے۔

موٹے رام۔ آج ہی ہو سکتا ہے۔ ہاں پہلے دیوتاؤں کے آواہن (بلانے) کیلیئے کچھ روپے دِلا دیجئے۔

روپیوں کی کمی ہی کیا تھی۔ پنڈت جی کو روپے مل گئے اور وہ خوش خوش گھر آئے۔ بیوی سے سارا حال کہا۔ اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ تم نے ناحق یہ روگ اپنے سر لیا۔ بھوک نہ سہہ سکے تو؟ سارے شہر میں بدنامی ہو جائے گی؟ لوگ

ہنسی اُڑاتیں ہے۔ روپے کو مٹا دو۔

موٹے رام نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ بھوک کیسے نہ برداشت ہوگی؟ میں ایسا مورکھ تھوڑا ہی ہوں کہ یونہی جا بیٹھوں گا؟ پہلے میرے کھانے کا بندوبست کرو۔ امرتیاں۔ لڈو۔ رس گُلے منگاؤ۔ پیٹ بھر کھالوں۔ پھر آدھ سیر ملائی کھاؤنگا۔ اس کے اُوپر آدھ سیر بادام کی ہتھ جماؤنگا۔ بچی کھچی کسر ملائی والے دہی سے پوری کر دونگا۔ پھر دیکھونگا کہ بھوک کیونکر پاس پھٹکتی ہے۔ تین دن تک تو سانس ہی نہ لی جاویگی بھوک کو کون چلاوے۔ اتنے میں تو سارے شہر میں کھلبلی مچ جاویگی۔ بھاگ کا سورج اُدے (طلوع) ہوتا ہے اس وقت آگا پیچھا کرنے سے پچھتانا پڑے گا۔ بازار نہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ مالا مال ہو جاؤنگا نہیں تو یہاں گانٹھ سے کیا جاتا ہے؟ سو روپے تو ہاتھ لگ گئے۔

ادھر تو کھانے کا بندوبست ہوا۔ اُدھر پنڈت موٹے رام نے منادی کرادی کہ شام کے وقت ٹاؤن ہال کے میدان میں موٹے رام ملک کے سیاسی مسئلہ پر لکچر دینگے سب لوگ ضرور آویں۔ پنڈت جی ہمیشہ سیاسی امور سے علیٰحدہ رہتے تھے آج وہ انہیں امور کے متعلق کچھ کہیں گے سننا چاہیئے۔ لوگوں کو شوق ہوا۔ پنڈت جی گھر سے بخوبی تیار ہو کر پہنچے۔ پیٹ اتنا بھرا ہوا تھا کہ چلنا مشکل تھا۔ جونہی یہ وہاں پہنچے۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر انہیں مؤدبانہ ڈنڈوت پرنام کیا۔

موٹے رام بولے۔ شہر والو۔ کاروباری لوگو سیٹھو اور مہاجنو! میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے کانگریس والوں کے کہنے میں آکر بڑے لاٹ صاحب کے یہاں آنے کے موقعہ پر ہڑتال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہ کتنی بڑی نمک حرامی ہے وہ چاہیں تو آج لوگوں کو توپ کے منہ پر اُڑا دیں۔ سارے شہر کو کھدوا ڈالیں۔ راجہ ہیں۔ ہنسی ٹھٹھا نہیں وہ طرح دیئے جاتے ہیں تمہاری خیر یہ دیا کرتے ہیں۔ اور تم گیدڑوں کی طرح بنیا کے بل پر کھیت چرنے کو تیار ہو۔ لاٹ صاحب چاہیں تو آج ریل بند کر دیں ڈاک بند کر دیں مال کا آنا جانا بند کر دیں۔ تب بتاؤ

کیا کرو گے؟ تم ان سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ ہے کہیں ٹھکانہ؟ اس لیے جب اسی دیش میں اور انہیں کے ماتحت رہنا ہے تو اتنا جھگڑا کیوں مچاتے ہو؟ یاد رکھو۔ تمہاری جان ان کی مٹھی میں ہے۔ طاعون کے کیڑے پھیلا دیں تو سارے شہر میں تہلکہ مچ جائے۔ تم بھاڑ سے آندھی کو روکنے چلے ہو؟ خبردار جو کسی نے بازار بند کیا۔ نہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میں دانہ پانی بنا بیوان سے دوں گا۔

ایک آدمی نے سوال کیا۔ مہاراج! آپ کے پران نکلتے نکلتے مہینہ بھر سے کم نہ لگے گا۔ تین دن میں کیا ہوگا؟

موٹے رام نے گرج کر کہا۔ پران بدن میں نہیں رہتا۔ برہمانڈ میں رہتا ہے۔ میں چاہوں تو یوگ کر کے ابھی پران چھوڑ سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں چیتاونی دے دی۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ میرا کہنا مانوگے تو تمہارا کلیان ہوگا۔ نہ مانوگے تو ہتیا لگے گی۔ دنیا میں کبھی منہ نہ دکھا سکو گے۔ بس یہ لو میں آسن جماتا ہوں۔

(۴)

شہر میں یہ خبر پھیلی تو لوگوں کے ہوش اُڑ گئے۔ حکام کی اس نئی چال نے ان کو مبہوت سا کر دیا۔ کارکنانِ کانگریس تو اب بھی کہتے تھے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سرکار نے کچھ دے دلا کر یہ سوانگ کھڑا کیا ہے۔ جب اور کوئی بس نہ چلا۔ فوج۔ پولیس۔ قانون سبھی تدبیروں سے ہار گئے تو یہ نئی حکمت نکالی ہے۔ یہ اور کچھ نہیں سیاست کا دیوالہ ہے۔ ورنہ پنڈت جی ایسے کہاں کے ملکی خادم تھے۔ جو ملک کی حالت سے غمگین ہو کر برت ٹھانتے۔ انہیں بھوکوں مرنے دو۔ دو دن میں بول جائیں گے۔ اس نئی چال کی جڑ ابھی سے کاٹ دینی چاہیے۔ کہیں یہ چال چل گئی۔ تو سمجھ لو کہ حکام کے ہاتھ میں ایک نیا ہتھیار آ جائے گا۔ اور وہ ہمیشہ اس کا استعمال کریں گے۔ عام لوگ اتنے سمجھدار تو ہیں نہیں کہ ان چالوں کو سمجھیں۔ گیدڑ بھبکی میں آ جائیں گے۔

لیکن شہر کے بنئے مہاجن جو مذہبی معاملات میں عموماً ڈرپوک ہوتے ہی ہیں ایسے گھبرا گئے کہ ان پر ان باتوں کا کچھ اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہتے مہنت صاحب! آپ لوگوں کے کہنے سے سرکار سے بُرے بنے۔ نقصان اُٹھانے کو تیار ہوئے۔ کاروبار ترک کیا۔ کتنوں کے دیوالے نکل گئے۔ افسروں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے پہلے جہاں جاتے تھے۔ حکام لوگ آیئے سیٹھ جی کہہ کر عزت بخشتے تھے۔ اب ریل گاڑیوں میں دھکے کھا لیتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں سنتا۔ آمدنی چاہے کچھ ہو۔ یا۔ نہ ہو۔ بہیوں کا فن دیکھ کر ٹیکس بڑھا جاتا ہے۔ یہ سب سہا اور سہیں گے مگر دھرم کے معاملہ میں ہم آپ لوگوں کا کہنا نہیں مان سکتے۔ جب ایک ودوان کلین اور دھرم کرم والا برہمن ہمارے اوپر دانہ پانی چھوڑ رہا ہے تب ہم کیونکر بھوجن کریں اور پیر پھیلا کر سوئیں؟ کہیں مر گیا۔ تو بھگوان کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

خلاصہ یہ کہ کانگرس والوں کی ایک نہ چلی۔ بیوپاریوں کا ایک وفد نو بجے رات کو پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پنڈت جی نے آج کھانا تو خوب ڈٹ کر کھایا تھا لیکن اس طرح کھانا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مہینے میں عموماً بیس روز وہ ضرور مدعو ہوتے تھے۔ اور دعوت میں شکم سیر ہو کر کھانا بالکل قدرتی بات ہے۔ اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی لاگ ڈانٹ کی دُھن میں یا مالک کے انکسار آمیز اصرار سے اور سب سے زیادہ اشیائے خوردنی کی عمدگی کے سبب کھانا حد سے زیادہ ہو ہی جاتا ہے۔ پنڈت جی کی قوتِ ہاضمہ ایسے امتحانوں میں پاس ہوتی رہتی تھی۔ بس اس وقت کھانے کا وقت آ جانے سے اُن کی نیت کچھ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ بھوک سے بیقرار تھے لیکن کھانے کا وقت آ جانے سے اگر پیٹ خوب بھرا ہوا نہ ہو۔ بدہضمی نہ ہو گئی ہو۔ تو دل میں ایک طرح کی کھانے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ شاستری جی کی اس وقت یہی حالت ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کسی خوانچہ والے کو بلا کر کچھ لے لیتے۔ مگر حکام نے ان کی جسمانی

حفاظت کے لئے وہاں کئی سپاہیوں کو تعینات کر دیا تھا۔ وہ سب ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ پنڈت جی کی بڑی عقل اس وقت یہی مسئلہ حل کر رہی تھی کہ ان شیطانوں کو کیسے ٹالوں؟ خواہ مخواہ ان پاجیوں کو یہاں کھڑا کر دیا۔ میں کوئی قیدی تو ہوں نہیں کہ بھاگ جاؤں گا۔

حکام نے خاص یہ انتظام اس لئے کر رکھا تھا کہ کانگریس والے جبراً پنڈت جی کو وہاں سے بھگانے کی کوشش نہ کر سکیں۔ کون جانے کیا چال چلیں۔ کہیں کسی کتے ہی کو ان پر چھوڑ دیں یا دور سے پتھر پھینکنے لگیں۔ ایسے نامناسب اور ہتک آمیز سلوکوں سے پنڈت جی کی حفاظت کرنا حکام کا فرض تھا۔

وہ ابھی اسی فکر میں تھے کہ بیوپاریوں کا وفد آ پہنچا۔ پنڈت جی کہنی کے بل لیٹے ہوئے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پشیمان وفد نے ان کے قدم چھو کر کہا مہاراج! ہمارے اوپر آپ نے کیوں کوپ (غصہ) کیا ہے۔ آپ کا حکم ہے۔ وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ آپ اُٹھیے کھانا پینا شروع کیجئے ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ سچ مچ یہ برت ٹھاننے والے ہیں۔ نہیں تو ہم پہلے ہی آپ سے بنتی (عرض) کرتے۔ اب کرپا کیجئے۔ دس بجنے کا وقت ہے۔ ہم آپ کی بات کبھی نہ ٹالیں گے۔

یہ کانگریس والے تمہیں ملیا میٹ کر کے چھوڑیں گے۔ آپ تو ڈوبتے ہی ہیں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔ بازار بند رہے گا۔ تو اس سے تمہارا گھاٹا ہوگا۔ سرکار کو کیا؟ تم نوکری چھوڑ دو گے تو آپ بھوکوں مرو گے سرکار کو کیا۔ نہ جانے ان کمبختوں کو کیا سنک سوار ہو گئی ہے۔ اپنی ناک کٹا کر دوسروں کا اسگن مناتے ہیں تم ان ابرے لوگوں کے بہکانے میں نہ آؤ۔ کیوں؟ دکانیں کھلی نہ رکھو گے؟

سیٹھ:— مہاراج جب تک شہر بھر کے آدمیوں کی پنچایت نہ ہو جائے تب تک ہم اس کا بیمہ کیسے لے سکتے ہیں؟ کانگریس والوں نے کہیں لوٹ مچا دی۔ تو کون ہماری مدد کرے گا؟ آپ اُٹھیے۔ بھوجن کیجئے۔ ہم کل پنچایت کر کے آپ کی خدمت میں جیسا

کچھ ہوگا۔ عرض کرینگے۔

موٹے رام۔ تو پھر پیٹ بھر کے آنا۔

ڈیپوٹیشن جب باہر ہو کر لوٹنے لگا۔ تو پنڈت جی نے کہا۔ کسی کے پاس سنگھی تو نہیں ہے؟ ایک شخص نے ڈبیا نکال کر دی۔

(۱۳)

لوگوں کے چلے جانے پر موٹے رام نے پولیس والوں سے پوچھا۔ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ سپاہیوں نے کہا۔ "صاحب کا حکم ہے۔ ہم کیا کریں؟"

موٹے رام۔ یہاں سے چلے جاؤ۔

سپاہی۔ آپ کے کہنے سے چلے جائیں؟ کل نوکری چھوٹ جائیگی تو آپ کھانے کو دینگے؟

موٹے رام۔ ہم کہتے ہیں چلے جاؤ۔ نہیں تو ہمیں یہاں سے چلے جائینگے۔ ہم کوئی قیدی نہیں ہیں۔ جو تم گھیرے کھڑے ہو؟

سپاہی۔ چلے کہاں جائیے گا۔ مجال ہے؟

موٹے رام۔ مجال کیوں نہیں ہے بے؟ کوئی جرم کیا ہے؟

سپاہی۔ اچھا جاؤ تو دیکھیں۔

پنڈت جی اپنے برہمنی رعب میں آ کر اُٹھے اور ایک سپاہی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پر جا گرا۔

دوسرے سپاہیوں کی ہمت چھوٹ گئی۔ پنڈت جی کو ان سبھوں نے محض موٹا سمجھ لیا تھا۔ ان کی طاقت دیکھی تو چپکے سے چل دیئے۔

موٹے رام اب لگے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے کہ کوئی خوانچہ والا نظر آ جائے تو اس سے کچھ لیں مگر فوراً خیال آ گیا کہ اس نے کسی سے کہہ دیا تو لوگ تالیاں بجانے لگینگے نہیں ایسی ہوشیاری سے کام کرنا چاہیئے کہ کسی کے کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایسے ہتکھنڈے (تکلیف)

کے موقعوں ہی پر تو بدھی کے بل کا پتہ چلتا ہے ایک لمحہ میں انہوں نے اس مسئلہ کو حل کر لیا۔
اتفاقاً اسی وقت ایک خوانچہ والا جاتا دکھائی دیا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ پنڈت جی نے آواز دی۔ خوانچے والے او خوانچے والے!

خوانچہ والا۔ کہئے کیا دوں؟ بھوک لگ آئی نہ۔ دانہ پانی چھوڑنا سادھوؤں کا کام ہے۔ ہمارا آپ کا کام نہیں۔

موٹے رام۔ ابے کیا بکتا ہے؟ یہاں کیا کسی سادھو سے کم ہیں؟ چاہیں تو مہینوں پڑے رہیں، اور بھوک پیاس نہ لگے۔ تجھے تو صرف اس لئے بلایا ہے کہ ذرا اپنی کپی (چراغ) مجھے دیدے۔ دیکھوں تو وہاں کیا رینگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں سانپ نہ ہو۔

خوانچہ والا نے چراغ اُتار کر دیدیا۔ پنڈت جی اسے لے کر ادھر اُدھر زمین پر کچھ کھوجنے لگے کہ اتنے میں چراغ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اور بجھ گیا۔ پنڈت جی نے اسے ایک ٹھوکر لگائی کہ بچا کچھا تیل بھی بہہ جائے۔

خوانچہ والا (چراغ ہلاکر) مہاراج اس میں تو ذرا بھی تیل نہیں بچا۔ اب تم چار پیسے کا سودا بیچتا۔ آپ نے یہ کھڑاگ بڑھا دیا۔

موٹے رام۔ بھیا۔ ہاتھ ہی تو ہے۔ چھوٹ پڑا تو اب کیا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔ یہ لو پیسے جاکر کہیں سے تیل بھرا لو۔

خوانچہ والا (پیسے لے کر) تو اب تیل بھرا کر یہاں تھوڑے آؤں گا۔

موٹے رام۔ خوانچہ رکھے جاؤ۔ لپک کر تھوڑا تیل لے لو۔ نہیں تو مجھے سانپ کاٹ لے گا۔ تو تمہیں ہتیا لگے گی۔ کوئی جانور ہے ضرور۔ دیکھو وہ رینگتا ہے۔ غائب ہو گیا۔ دوڑ جاؤ! اچھے تیل لیتے آؤ۔ میں تمہارا خوانچہ دیکھتا رہوں گا۔ ڈرتے ہو۔ تو اپنے روپے پیسے لیتے جاؤ۔

خوانچہ والا بڑے شش و پنج میں پڑا۔ خوانچہ سے پیسے نکالتا ہے تو خوف ہے

کہ پنڈت جی اپنے دل میں بُرا نہ منائیں۔ سوچیں کہ مجھے بے ایمان سمجھ رہا ہے چھوڑ کر جاتا ہے تو کون جانے اُن کی نیت کیا ہو۔ آخر اُس نے طے کیا کہ خوانچہ یہیں چھوڑ دوں جو کچھ تقدیر میں ہوگا وہی ہوگا۔ وہ اُدھر بازار کی طرف چلا اُدھر پنڈت جی نے خوانچہ پر نگاہ ڈالی مٹھائی بہت کم بچ رہی تھی۔ پانچ چھ چیزیں تھیں مگر کسی میں سے دو عدد سے زیادہ نکالنے کی گنجائش نہ تھی بھانڈا پھوٹ جانے کا خدشہ تھا۔ پنڈت جی نے سوچا۔ گناہ اتنے سے کیا ہوگا۔ صرف بھوک اور تیز ہو جائیگی۔ شیر کے مُنہ میں خون لگ جائے گا۔ گناہ بے لذت ہے اپنی جگہ پہ بیٹھے لیکن دم بھر بعد پیاس نے پھر زور کیا سوچا کہ کچھ تو ڈھارس ہو ہی جائیگی کھانا کتنا ہی کم ہو پھر بھی کھانا ہی ہے۔ اُٹھے اور مٹھائی نکالی مگر پہلا ہی لڈو مُنہ میں رکھا تھا کہ دیکھا خوانچہ والا کچھ جلدی قدم بڑھاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اس کے آنے کے قبل مٹھائی کا ختم ہونا ضروری تھا۔ ایک ساتھ دو چیزیں مُنہ میں رکھیں ابھی چبا ہی رہے تھے کہ وہ شیطان دس قدم اور آگے بڑھ آیا ایک ساتھ چار چیزیں مُنہ میں ڈالیں۔ ادھ کچلی ہی نگل گئے۔ ابھی چھ اور تھیں اور خوانچہ والا بیچ سڑک تک آ چکا تھا۔ سب کی سب مٹھائی مُنہ میں ڈال لی۔ اب نہ نگلتے بنتا ہے نہ اُگلتے اور وہ شیطان موٹر کی طرح کُپّی چمکاتا چلا ہی آتا ہے جب وہ بالکل سامنے آگیا تو پنڈت جی نے جلدی سے ساری مٹھائی نگل لی۔ مگر آخر آدمی ہی تھے۔ کوئی مگر گھڑیال تو تھے نہیں۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ گلا پھنس گیا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے زور سے کھانسنے لگے۔ خوانچہ والا نے تیل کی کُپّی بڑھاتے ہوئے کہا یہ لیجئے دیکھ لیجئے چلے تو ہیں آپ اُپاس (فاقہ) کرنے۔ مگر جان کا اتنا ڈر ہے۔ آپ کو کیا پرواہ۔ جان بھی نکل جائے گی تو سرکار بال بچوں کی پرورتی (پرورش) کرے گی۔

پنڈت جی کو غصہ تو ایسا آیا کہ اس پاجی کو کھوٹی کھری سُنا دیں۔ مگر گلے سے آواز نہ نکلی۔ کُپّی چپکے سے لے لی۔ اور جھوٹ مُوٹ اِدھر اُدھر دیکھ کر لوٹا دی۔

خوانچہ والا صاحب کو کیا پڑی تھی۔ جو چلے سرکار کا پچھ (طرفداری) کرنے۔ کہیں کل ملا کر

پنچائیت ہو گی۔ تب رات تک جا کر کچھ طے ہوگا۔ تب تک تو آپ کی آنکھوں میں تتلیاں اُڑنے لگیں گی۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پنڈت جی تھوڑی تک کھانسنے کے بعد سو رہے۔

(۵)

دوسرے دن سویرے سے ہی سب بیوپاریوں نے صلاح مشورہ شروع کیا۔ اِدھر کانگرس والوں میں بھی ہلچل مچی۔ امن سبھا کے عہدیداروں نے بھی کان کھڑے کئے۔ یہ تو ان بھولے بھالے بنیوں کو دھمکانے کی اچھی ترکیب ہاتھ آئی۔ پنڈت سماج نے الگ ایک سبھا کی اور اس میں یہ طے کیا کہ پنڈت موٹے رام کو سیاسی معاملات میں پڑنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق؟ غرض سارا دن اسی بحث مباحثہ میں گزر گیا اور کسی نے پنڈت جی کی خبر نہ لی۔ لوگ اعلانیہ کہتے تھے کہ پنڈت جی نے ایک ہزار روپے سرکار سے لے کر یہ انوشٹھان کیا ہے۔ بیچارے پنڈت جی نے رات پوٹ کر کاٹی۔ مگر اُٹھے تو بدن مُردہ سا معلوم ہوتا تھا۔ کھڑے ہوتے تھے تو آنکھیں تلملانے لگتی تھیں۔ سر میں چکر آ جاتا تھا۔ پیٹ میں جیسے کوئی بیٹھا ہوا کُرید رہا ہو۔ سڑک کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ لوگ منانے تو نہیں آ رہے ہیں۔ پوجا پاٹ کا وقت اسی انتظار میں گزر گیا۔ اس وقت پُوجا کے بعد روز ناشتہ کیا کرتے تھے۔ آج ابھی مُنہ میں پانی بھی نہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ شُبھ گھڑی کب آویگی۔ پھر پنڈتائن پر غصہ آنے لگا۔ آپ تو رات بھر پیٹ کھا کر سوئی ہوگی اس وقت بھی جل پان (ناشتہ) کر ہی چکی ہوگی۔ مگر ادھر بھول کر بھی نہ جھانکا کہ مرے یا جیے ہیں۔ کچھ بات کرنے ہی کے بہانے سے کیا تھوڑا سا موہن بھوگ بنا کر نہ لا سکتی تھی۔ مگر کسے اتنی فکر ہے۔ روپیہ لیکر رکھ لیا۔ پھر جو کچھ ملیگا اُسے بھی رکھ لے گی۔ مجھے اچھا اُلو بنایا۔

قصہ کوتاہ پنڈت جی نے تمام دن انتظار کیا۔ مگر کوئی منانے والا نظر نہ آیا لوگوں کے دل میں جو شبہ پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی نے کچھ لے دے کر یہ سوانگ بھرا ہے محض اپنی خودغرضی

کے سبب سے ڈھکوسلا کھڑا کیا ہے۔ وہی اُن کو کھانے میں عارض ہوتا تھا۔

(۶)

رات کے نو بج گئے تھے۔ سیٹھ بھوندو مل نے جو بیوپاری سماج کے پیشوا تھے تیقن آمیز لہجہ میں کہا۔ مان لیا کہ پنڈت جی نے کسی لالچ ہی سے یہ برت کیا ہے مگر اس سے وہ تکلیف تو کم نہیں ہو سکتی جو دانہ پانی کے بغیر ہر جاندار کو ہوتی ہے۔ یہ دھرم کے خلاف ہے کہ ایک برہمن ہمارے اُوپر دانہ پانی چھوڑ دے، اور ہم پیٹ بھر بھر کر چین کی نیند سوئیں۔ اگر انہوں نے دھرم کے خلاف کام کیا ہے تو اس کا ڈنڈ انہیں بھوگنا پڑے گا۔ ہم کیوں اپنے فرض سے مُنہ موڑیں

کانگریس کے سکرٹری نے دبے ہوئے لہجہ میں کہا۔ مجھے تو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ آپ لوگ سماج کے پیشوا ہیں۔ جو فیصلہ کریں منظور ہے۔ چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلا چلوں گا۔ دھرم کا کچھ حصہ مجھے بھی مل جائے گا۔ مگر ایک عرض سُن لیجئے۔ آپ لوگ پہلے مجھے وہاں جانے دیجئے میں تنہائی میں ان سے دس منٹ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ پھاٹک پر کھڑے رہئے گا۔ جب میں وہاں سے لوٹ آؤں تو پھر جائیے ہولی۔

اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ عرض قبول ہوئی۔

سکرٹری صاحب پولیس کے محکمہ میں بہت زمانہ رہ چکے تھے۔ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ وہ سیدھے بازار گئے اور پانچ روپے کی مٹھائی خریدی اس میں اندازہ سے زیادہ خوشبو ڈالنے کا بندوبست کیا۔ نقرئی ورق لگوائے اور ایک دُونے میں لئے ہوئے رُوٹھے برہمن دیوتا کی پُوجا کرنے چلے۔ ایک مٹی کی صراحی میں ٹھنڈا پانی لیا اور اس میں عرق کیوڑا ملایا۔ دونوں چیزوں سے تیز خوشبو اُڑ رہی تھی۔ خوشبو میں کتنی تحریک قوت ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ اس سے بلا بھوک کے بھوک لگتی ہے پھر بھوکے آدمی کی تو بات ہی کیا ہے۔

پنڈت جی اس وقت بدحواس زمین پر پڑے تھے۔ رات کو کچھ نہیں ملا۔ دس پانچ چھوٹی چھوٹی مٹھائیوں کا کیا شمار۔ دوپہر کو کچھ نہیں ملا۔ اور اس وقت بھی کھانے کا وقت گزر

چکا تھا۔ بھوک میں اب امید کی بیتابی نہیں مایوسی کا سکون تھا۔ سارے اعضا سست پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھیں بھی نہ کھلتی تھیں۔ انہیں کھولنے کی بار بار کوشش کرتے۔ مگر خود بخود بند ہو جاتیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت تھی تو بس ان کا آہستہ آہستہ کراہنا۔ ایسی سخت مصیبت ان پر کبھی نہ پڑی تھی۔ بدہضمی کی شکایت تو انہیں مہینے میں دو چار بار ہو جاتی تھی جسے وہ ہڑ وغیرہ کی پھنکیوں سے دور کر لیا کرتے تھے۔ مگر بدہضمی میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ انہوں نے غذا ترک کر دی ہو۔ اہالیانِ شہر کو، اس سماج کو، سرکار کو، کانگریس کو اور اپنی اہلیہ کو جی بھر کر کوس چکے تھے۔ کسی سے کوئی امید نہ تھی۔ اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ خود کھڑے ہو کر بازار جا سکیں۔ یقین ہو گیا کہ آج رات کو جان ضرور نکل جائے گی۔ زندگی کا دھاگا کوئی رسی تو ہے نہیں کہ چاہے جتنے جھٹکے دو، ٹوٹنے کا نام نہ لے۔

سکریٹری نے پکارا۔ شاستری جی!

موٹے رام نے پڑے پڑے آنکھیں کھول دیں۔ ان میں درد و غم بھرا ہوا تھا۔ جیسے کسی لڑکے کے ہاتھ سے کوا مٹھائی لے گیا ہو۔

سکریٹری نے دونے کی مٹھائی سامنے رکھ دی اور صراحی پر مٹی کا آبخورہ رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر بولے "یہاں کب تک پڑے رہئے گا۔"

خوشبو نے پنڈت جی کے حواس پر امرت کا کام کیا۔ پنڈت جی اٹھ بیٹھے اور بولے۔ "دیکھو کب تک فیصلہ ہوتا ہے۔"

سکریٹری۔ یہاں کچھ فیصلہ وغیرہ نہ ہوگا۔ آج دن بھر پنچایت ہوا کی۔ کچھ طے نہ ہوا۔ کل کہیں شام کو لاٹ صاحب آویں گے۔ اس وقت تک تو نہ جانے آپ کی کیا حالت ہو گی۔ آپ کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔

موٹے رام۔ یہیں مرنا بدا ہوگا تو کون ٹال سکتا ہے۔ اس دونے میں قلاقند ہے کیا؟

سکریٹری۔ ہاں طرح طرح کی مٹھائیاں ہیں۔ ایک زمیندار نے یہاں برہمن بھیجنے کو خاص طور پر تیار

کرائی ہیں۔"

موٹے رام۔ جبھی اس میں اتنی خوشبو ہے۔ دونا کھولئے تو۔"

سکرٹری نے مسکرا کر دونا کھول دیا۔ تو پنڈت جی آنکھوں سے مٹھائیاں کھانے لگے۔ اندھا آنکھیں پا کر بھی دُنیا کو ایسی ہوس انگیز نگاہوں سے نہ دیکھے گا۔ مُنہ میں پانی بھر آیا سکرٹری نے کہا

"آپ کا برت نہ ہوتا تو دو چار مٹھائیاں آپ کو چکھاتا۔ پانچ روپے سیر کے دام دیئے ہیں۔"

موٹے رام۔ تب تو بہت ہی بڑھیا ہوں گی۔ مَیں نے بہت دن ہوئے۔ قلاقند نہیں کھائی۔

سکرٹری۔ آپ نے بھی تو بیٹھے بٹھائے جھنجھٹ مول لے لیا۔ جان ہی نہ رہے گی تو روپیہ کس کام آوے گا؟

موٹے رام۔ کیا کروں؟ پھنس گیا۔ مَیں اتنی مٹھائیوں کا جل پان کر جاتا تھا۔ ذرا ہاتھ سے مٹھائیوں کو ٹٹول کر بھولا کی دوکان کی ہوں گی؟

سکرٹری۔ چکھئے دو چار۔

موٹے رام۔ کیا چکھوں۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہُوں۔

سکرٹری۔ اجی چکھئے بھی۔ اس وقت جو آنند ملیگا۔ وہ لاکھ روپے میں بھی نہیں مل سکتا۔ کوئی کسی سے کہنے جاتا ہے کیا؟

موٹے رام۔ مجھے ڈر کس کا ہے؟ میں یہاں دانہ پانی بنا مر رہا ہوں۔ اور کسی کو پرواہ ہی نہیں ہے۔ تو پھر مجھے کیا ڈر۔ لاؤ اِدھر دونا بڑھاؤ۔ جاؤ سب سے کہہ دینا کہ شاستری جی نے برت توڑ دیا۔ بھاڑ میں جائے بازار اور بیوپار۔ یہاں کسی کی پرواہ نہیں جب کسی میں دھرم نہیں رہا۔ تو مَیں نے ہی دھرم کا بیڑا تھوڑے ہی اُٹھایا ہے۔

یہ کہہ کر پنڈت جی نے دونا اپنی طرف کھینچ لیا اور لگے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ میں نصف دونا ختم ہو گیا۔ سیٹھ لوگ آ کر پھاٹک پر کھڑے تھے۔ سکریٹری نے جا کر کہا۔ ذرا تماشہ دیکھئے آپ لوگوں کو نہ بازار کھولنا پڑے گا۔ نہ خوشامد کرنی پڑے گی۔ میں نے ساری مشکلیں حل کر دیں۔ یہ کانگرس کا اقبال ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لوگوں نے آ کر دیکھا کہ پنڈت جی مٹھائی ٹھکانے لگانے میں ویسے ہی محو ہیں جیسے کوئی مہاتما سمادھی میں محو ہیں۔

جھونڈو مل نے کہا۔ پنڈت جی کے چرن چھوتا ہوں۔ ہم لوگ تو آ ہی رہے تھے۔ آپ نے کیوں جلدی کی۔ ایسی ترکیب بتاتے کہ آپ کا برت بھی نہ ٹوٹتا۔ اور کام بھی پورا ہو جاتا۔

موٹے رام۔ یہ میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ سُرگ کا آنند ہے۔ جو دھن کے ڈھیروں سے نہیں مل سکتا ۔۔۔۔۔ اگر کچھ شردھا اعتقاد ہو تو اسی دکان کی اتنی مٹھائی اور منگوا دو۔

۱؎ ہم یہ کہنا بھول گئے کہ سکریٹری صاحب کو میدان میں آتے وقت پولیس کے سپاہی کو ٹکے دینے پڑے تھے۔ یہ خلاف قاعدہ تھا۔ لیکن سکریٹری نے اس بات پر اڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

مزارِ آتشیں

(۱)

اہل کمال کی صحبت میں بُرے بھی بھلے ہو جاتے ہیں۔ مگر پیاگ کی بدنصیبی تھی کہ اس پر اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اُسے گانجا چرس اور بھنگ کی چاٹ پڑ گئی اور کاہلی تو اس کا لازمی نتیجہ تھی۔ تگ و دو اور رنگ و تازہ میں یہ لُطف کہاں۔ کسی برگد کے سائے میں دھونی لگی ہوئی ایک جٹادھاری مہاتما رونق افروز ہیں۔ عقیدتمندوں کا ایک حلقہ مؤدب بیٹھا ہوا ہے۔ اور چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ چلم بھرنا پیاگ کا کام تھا۔ عقیدت مندوں کو تو اپنے لئے پر لوک کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پیاگ کی تقدیر اپنے ہاتھ میں تھی۔ چلم پر پہلا حق اسی کا ہوتا تھا۔ آہ! مہاتماؤں کی ان صحبتوں میں اسے کتنا روحانی سرور حاصل ہوتا تھا اس پر بیخودی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ کسی دوسری منوّر اور مرصّع دنیا میں پہنچ جاتا تھا اس لئے جب اس کی بیوی رُکمن رات کے دس گیارہ بج جانے پر اُسے بلانے آتی تو پیاگ کو حقیقت تلخ کا تجربہ ہوتا۔ دُنیا اُسے ایک پُرخار جنگل ہی نظر آتی۔ بالخصوص جب گھر آنے پر اُسے معلوم ہوتا کہ چولھا نہیں جلا اور چنے چبینے کی فکر کرنا ہے۔ وہ ذات کا بھر تھا۔ گاؤں کی چوکیداری اس کی ملکیت تھی۔ دو روپے اور کچھ آنے تنخواہ کے ملتے تھے۔ وردی اور صافہ مفت تھا۔

ہفتے میں ایک دن تھانے جاتا۔ وہاں حکام کے دروازوں پر جھاڑو لگاتا۔ اصطبل صاف کرتا۔ اسی قبیل کے اور دوسرے کام کرتا جو بہ ضرورت کئے جاتے تھے کیونکہ سرکشی مالی اور جسمانی دونوں ہی پہلوؤں سے مہنگی پڑتی تھی۔ آنسوئیں بچتے تھے۔ کر چوکیداری میں

اگر کوئی کام تھا تو اتنا ہی۔ اور چاروں کے لئے دو روپے کئی آنے کم نہ تھے۔ پھر گاؤں میں اگر بڑے آدمیوں پر نہیں تو رذیلوں پر رعب تھا۔ تنخواہ پنشن تھی۔ اور جب سے مہاتماؤں کی صحبت شروع ہوئی۔ بیاگ کے صرفِ خاص کی مد میں آ گئی۔ اور معاش کا مسئلہ روز بروز تشویشناک صورت اختیار کرنے لگا۔ ان صوفیانہ چرچوں کے قبل دونوں گاؤں میں مزدوری کرتے تھے۔ رکمن لکڑیاں توڑ کر بازار لے جاتی۔ بیاگ کبھی آرا کشی کرتا کبھی ہل جوتتا۔ اُسے کسی کام سے عار نہ تھا۔ ہنس مکھ، زندہ دل۔ نیک نیت اور محنتی تھا۔ اور ایسا آدمی کبھی بھوکوں نہیں مرتا۔ پھر خدمت گزار ایسا کہ کسی کام کے لئے نہیں نہ کرتا۔ کسی نے کچھ کہا اور وہ اچھا بھیا کہہ کر دوڑا۔ اس لئے گاؤں میں اس کا رسوخ اور اعتقاد کافی تھا۔ اس کی بدولت صوفیانہ محبتوں کے باوجود دو تین سال تک اس کی آرام سے بسر ہوئی۔ دونوں وقت کا ذکر ہی کیا جب مہتو کو یہ بات حاصل نہ تھی جس کے دروازے پر چھ بیل بندھے نظر آتے تھے۔ تو بیاگ کی کیا ہستی تھی۔ ہاں ایک وقت کی دال روٹی میں کلام نہ تھا۔ مگر یہ مسئلہ روز بروز دشوار تر ہوتا جاتا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ رکمن بھی اب کسی وجہ سے اتنی وفا کیش، اتنی جاں نثار، اتنی جفاکش نہ تھی۔ اس کی قوتِ اظہار اور بیان میں حیرت انگیز تغیر ہوتا جاتا تھا۔ بیاگ کسی ایسے سخی کی تلاش میں تھا جو اُسے فکرِ معاش سے آزاد کر دے اور وہ بے غل و غش سرورِ روحانی سے بہرہ اندوز ہو۔ ایک دن رکمنی بازار سے لکڑیاں بیچ کر لوٹی۔ تو بیاگ نے کہا۔ "لا کچھ پیسے مجھے دیدے دم لگا آؤں"۔ رکمنی نے منہ پھیر کر کہا۔ "دم لگانے کا شوق ہے تو کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں؟"

بیاگ۔ بھلا چاہتی ہے تو پیسے دیدے۔ نہیں اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن میں کہیں نکل جاؤں گا۔ تب روئے گی۔

رکمنی نے انگوٹھا دکھا کر کہا۔ روئے میری بلا۔ تم نکل جاؤ گے تو میں بھوکوں نہ مر جاؤں گی۔ اب بھی چھاتی پھاڑ کر کماتی ہوں۔ تب بھی چھاتی پھاڑ کر کماؤں گی۔

پیاگ ۔ تو ہی پھیسلا ہے ۔

رکمنی ۔ ہاں ہاں کہہ تو دیا ۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں ۔ تمہارا جو جی چاہے کرو ۔

پیاگ ۔ گہنے بنوانے کے لئے پیسے ہیں ۔ اور میں پیسے مانگتا ہوں تو یوں جواب دیتی ہے ۔

رکمنی نے تنک کر کہا ۔ گہنے بنواتی ہوں تو تمہاری چھاتی کیوں پھٹتی ہے ۔ تم نے ایک پیتل کا چھلّا بھی تو نہیں دیا ۔

پیاگ اس دن گھر نہ آیا ۔ رات کے نو بج گئے ۔ تب رکمنی نے کھانا پکا کر کواڑ بند کر لئے ۔ سمجھی کہیں گاؤں میں چھپا بیٹھا ہوگا ۔ سمجھتا ہوگا ۔ مجھے منانے آئے گی ۔ میری بلا جاتی ہے ۔ دوسرے دن بھی پیاگ نہ آیا ۔ تب رکمنی کو اندیشہ ہوا ۔ گاؤں بھر دیکھ آئی ۔ کسی اڈّے پر پتہ نہ ملا ۔ اس دن اس نے رسوئی نہیں بنائی ۔ رات کو لیٹی بھی تو بہت دیر تک آنکھیں نہ لگیں ۔ خوف ہو رہا تھا ۔ پیاگ سچ مچ تو سادھو نہیں ہو گیا ۔ اس نے سوچا سویرے چل کر پتا پتا چھان ڈالوں گی ۔ کسی سادھو سنت کے پاس بیٹھا ہوگا ۔ سویرے وہ چلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ پیاگ آتا ہوا دکھائی دیا ۔ مگر اکیلا نہ تھا ۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت تھی ۔ اس کی چھینٹ کی نئی ساری ۔ رنگی ہوئی چادر ، اور شرمیلی چال دیکھ کر رکمنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔ وہ ایک لمحے تک مفلوج سی کھڑی رہی ۔ تب اس نے بڑھ کر نئی سوت کو ہاتھوں سے سنبھال لیا ، اور اُسے اس طرح آہستہ آہستہ گھر کے اندر لے چلی ۔ جیسے کوئی مریض علاج سے مایوس ہو کر زہر کا گھونٹ حلق کے اندر لے جائے ۔ جب محلّہ کی عورتیں چلی گئیں تو رکمنی نے پیاگ سے پوچھا ، اسے کہاں سے لائے ؟ پیاگ نے ہنس کر کہا ۔ گھر سے بھاگی جاتی تھی مجھے راستہ میں مل گئی ۔ ساتھ لے آیا ۔ گھر کا کام دھندا کرے گی ۔ پڑی رہے گی ۔

رکمنی ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ مجھ سے تمہارا جی بھر گیا ۔

پیاگ ۔ دت پگلی ! اسے تیری سیوا ٹہل کرنے کو لایا ہوں ۔

رکمنی نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا ۔ نئی کے آگے پرانی کون پوچھتا ہے ۔

پیاگ - چل - من جس سے ملے - وُہی نئی ہے - جس سے من ملے - وہ پُرانی ہے - لا کچھ پیسے ہوں تو دے - تین دن سے دم نہیں لگائی - پیر پیسے نہیں پڑتے - ہاں دیکھو دو چار دن اس بیچاری کو کھلا پلا دے - پھر تو آپ ہی کام کرنے لگے گی۔

رکمنی نے سمو چار روپیہ لا کر پیاگ کو دے دیا - دوسری بار کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔

(۲)

پیاگ میں اور چاہے کوئی مادہ ہو - یا نہ ہو - مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سیاست کے ابتدائی اصولوں سے واقف تھا - اس نے افتراق کی پالیسی پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا - ایک مہینہ تک کسی قسم کی پریشانی نہ ہوئی - رکمنی بے حد نرم ہو گئی تھی - بڑے سویرے اُٹھتی اور کبھی لکڑیاں توڑ کر کبھی چارا کاٹ کر کبھی اُپلے تھاپ کر بازار چلی جاتی - وہاں جو کچھ ملتا - اس کا نصف تو پیاگ کے پیٹ چڑھتا اور نصف میں گھر کا کام چلتا - وہ سوت کو کوئی کام نہ کرنے دیتی - پڑوسیوں سے کہتی - بہن سوت ہے تو کیا ہے تو ابھی بچی - دو چار مہینے بھی آرام سے نہ رہے گی تو کیا یاد کرے گی - میں تو کام کرنے کو ہوں ہی - گاؤں بھر میں اس کی وضعداری کا چرچا ہونے لگا - مگر صحبت یافتہ گھاگ پیاگ سب کچھ سمجھتا تھا - اور اپنی پالیسی کی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔

ایک دن نئی بہو نے کہا - "دیدی اب تو گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اُکتا ہے مجھے بھی کوئی کام دلا دو۔"

رکمنی - کیا میرے منہ میں کالک پتوانے پر لگی ہوئی ہے - بھیتر کا کام کئے جا - باہر کے واسطے تو میں ہوں ہی۔

بہو کا نام سلیا تھا - اس وقت تو سلیا نے کچھ جواب نہ دیا لیکن یہ لونڈیوں کی زندگی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی - میں دن بھر گھر کا کام کروں کوئی نہیں پوچھتا وہ باہر سے چار پیسے لاتی ہے تو مالکن بنی ہوئی ہے - اب میں بھی مزدوری کروں گی اور اس کا گھمنڈ توڑ دوں گی

ڈھونگی، بیاگ جیسے گنوار سے۔ بہ حقیقت اس پر رفتہ رفتہ واضح طور پر آشکارا ہو گئی جب رکمنی چار آنے لے کر بازار چلی گئی تو گھر کی نئی لگائی گاؤں میں اپنا تعارف کرنے چلی گاؤں میں بامیں گھما کر سب اکٹھے بیٹھے سبھی تھے ان سب گھروں میں سلیا کی آؤ بھگت ہوئی کسی نے چاول دیا کسی نے کچھ دوسرے دن سے سلیا پسائی کرنے لگی اس نے دائرہ عمل میں قدم رکھا پھر رات ہی سے چکی کی آواز آنے لگی۔

بیاگ نے پوچھا: "آج سلیا بڑے سویرے پیسنے لگی"۔

رکمنی۔ اپنے کو کیا تھا۔ میں تو بچارے اٹالائی ہوں جا کر دیکھتی ہوں نا۔

رکمنی نے بروٹھے میں جا کر دیکھا تو سلیا ایک ٹوکری میں دس پندرہ سیر گیہوں رکھے پیس رہی ہے رکمنی نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گیہوں کی ٹوکری اٹھا کر بولی تجھ سے پیسنے کو کس نے کہا ہے۔ کس کا گیہوں پیس رہی ہے۔

سلیا نے بیباکانہ انداز سے کہا۔ تم جا کر آرام سے سوتیں کیوں نہیں۔ میں پیستی ہوں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے چکی کی گھمر گھمر بھی نہیں سہی جاتی۔ لاؤ ٹوکری دیدو۔ بیٹھے بیٹھے کب تک کھاؤں گی۔ دو مہینے تو ہو گئے۔

رکمنی۔ میں نے تجھ سے کچھ نہیں کہا۔

سلیا۔ تم چاہے کہو۔ چاہے نہ کہو اپنا دھرم بھی تو کچھ ہے۔

رکمنی۔ تو ابھی یہاں کے آدمیوں کو نہیں جانتی۔ ایسا تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ پیسے دیتے وقت البتہ رو دیتے ہیں۔ کس کا گیہوں ہے میں تو سویرے اس کے گھر پھینک آؤں گی۔

سلیا نے رکمنی کے ہاتھ سے ٹوکری چھین لی اور بولی پیسے کیوں نہ دینگے کچھ بیگار کرتی ہوں۔

رکمنی۔ تو نہ مانے گی۔

سلیا۔ میں تمہاری لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔

بیاگ یہ تکرار سن کر آ پہنچا اور رکمنی سے بولا کام کرتی ہے تو کرنے دے۔ اب کیا جنم بھر بیٹھی ہی

رہے گی۔ ہاں تو گئے دو مہینے۔

رکمنی۔ تم کیا جانو۔ ناک تو میری کٹے گی۔

سلیا۔ تو کیا کوئی بیٹھے بیٹھے کھلا دیتا ہے چوکا برتن جھاڑو۔ پیسنا۔ کوٹنا یہ کون کرتا ہے پانی کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے۔ مجھ سے اب یہ تمہارا کام نہ ہوگا۔

پیاگ۔ تو ہی بجار جایا کر۔ گھر کا کام رہنے دے رکمنی کرے گی۔

رکمنی۔ ایسی بات منہ سے نکالتے لاج نہیں آتی۔ تین دن کی بہریا بجار میں گھومے گی تو سنسار کیا کہے گا۔

سلیا۔ سنسار کیا کہے گا۔ کیا کوئی عیب کرنے جاتی ہوں۔

سلیا کی ڈگری ہو گئی۔ عنان حکومت رکمنی کے ہاتھ سے نکل گئی۔ سلیا کی عملداری ہوئی جوان عورت تھی گیہوں پیس کر اٹھی تو اور عورتوں کیساتھ گھاس چھیلنے چلی گئی اور اتنی گھاس چھیلی کر سب دنگ رہ گئیں۔ گٹھا اٹھائے نہ اٹھتا تھا جو مرد اس کام میں بہت مشاق تھے۔ ان سے بھی اس نے بازی مار لی۔ یہ گٹھا بارہ آنے کو بکا۔ سلیا نے آٹا چاول دال۔ تیل نمک ترکاری مصالحہ سب کچھ لیا۔ پھر بھی اس کے پاس چار آنے بچ رہے رکمنی نے سمجھ رکھا تھا کہ سلیا بازار سے دو چار آنے پیسے لے کر لوٹے گی تو اسے ڈانٹوں گی اور دوسرے دن سے پھر بازار جانے لگوں گی مگر یہ سامان دیکھے تو اسکی آنکھیں کھل گئیں۔

پیاگ کھانے بیٹھا تو مصالحدار ترکاری سے لب بند ہو رہے تھے۔ مہینوں سے ایسی لذیذ چیز نہ میسر ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوا کھانا کھا کر باہر جانے لگا۔ تو سلیا برو ٹے میں کھڑی تھی۔ بولا آج کتنے پیسے ملے۔

سلیا۔ بارہ آنے ملے تھے۔

پیاگ۔ سب خرچ کر ڈالے کچھ بچے ہوں تو مجھے دے دے

سلیا نے بچے ہوئے چار آنے نکال کر دیئے۔ پیاگ پیسے کھنکھناتا ہوا بولا

تُو نے آج مالا مال کر دیا۔ رکمنی تو اتنے پیسے کبھی نہ دیتی تھی۔
سلیا۔ مجھے بٹور کر رکھنا تھوڑا ہے۔ پیسے کھانے پینے کے لئے ہیں گاڑ کر رکھنے کے لئے
پیاگ۔ اب تو ہی بچار جایا کر۔ رکمنی گھر کا کام کرے گی۔ اور دیکھ میں یہیں بیٹھوں گا۔
جرا چلی آنا۔ تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

(۲۰)

رکمنی اور سلیا میں اب معرکۂ کارزار گرم ہو گیا۔ سلیا پر سرِ اختیار رہنے کے لئے دن بروز زیادہ محنت کرتی۔ پہر رات سے گیہوں پیستی پھر گھاس لاتی اور بازار جاتی وہاں سے لوٹ کر جو گھنٹہ آدھ گھنٹہ وقت بچتا اُسے بھی بیکار نہ کھوتی۔ سن کاتتی۔ اتنی ہی تھی رکمنی اُس کے انتظام میں نقص نکالا کرتی۔ اور جب موقعہ ملتا گوبر بٹور کر اُپلے پاتھتی اور گاؤں ہی میں اُپلے بیچ کر پیسے لاتی۔ پیاگ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے۔ دونوں بیویاں اُسے زیادہ سے زیادہ پیسے دیتیں اور اُسکی خوشنودیٔ مزاج کا بہترین حصہ اپنے تصرف میں کرنے کی کوشش کرتی رہتیں۔ مگر سلیا نے کچھ ایسا آسن جما لیا تھا کہ کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن دونوں میں اعلانِ جنگ ہو گیا۔ سلیا گھاس لے کر آئی تو پسینے میں تر تھی۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سوچا نہا کر بازار جاؤں گھاس دروازے پر رکھ کر وہ تالاب نہانے چلی گئی۔ رکمنی نے تھوڑی سی گھاس نکال کر پڑوس کے گھر میں چھپا دی اور گٹھے کو ڈھیلا کر کے برابر کر دیا۔ سلیا نہا کر لوٹی تو گھاس کم معلوم ہوئی رکمنی سے پوچھا اس نے لاعلمی جتائی۔ سلیا نے گالیاں دینا شروع کیں جس نے میری گھاس چھوئی ہو۔ اُس کے بدن میں کیڑے پڑیں۔ اس کے باپ اور بھائی مر جائیں اسکی آنکھیں پھوٹ جائیں۔

رکمنی کچھ دیر تک ضبط کئے بیٹھی رہی۔ مگر آخر خون میں اُبال آ ہی گیا جھلا کر اُٹھی اور سلیا کے دو تین طمانچے لگا دیئے۔ سلیا دھاڑیں مار مار کر رونے لگی سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سلیا نے

اپنے حُسنِ خدمات سے گاؤں والوں میں حسد کی آگ مشتعل کر دی تھی وہ سب سے زیادہ گھاس کیوں چھیلتی ہے۔ سب سے زیادہ لکڑیاں کیوں توڑ لاتی ہے۔ اتنے سویرے کیوں اُٹھتی ہے۔ اتنے پیسے کیوں کماتی ہے۔ ان وجوہ نے اسے پڑوسیوں کی ہمدردی سے محروم کر دیا تھا۔ سب اس کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ مُٹھی بھر گھاس کے لئے اتنا سا منھ پھاڑ ڈالا۔ اتنی گھاس تو آدمی جھاڑ کر پھینک دیتا ہے پھر تمہیں سوچنا چاہیئے تھا اگر کسی نے لے لی ہے تو گاؤں گھر ہی کا ہوگا۔ باہر کا چور تو آیا نہیں۔ تم نے اتنی گالیاں کس کو دیں پڑوسیوں کو ہی تو۔

اُس دن پیاگ تھانے گیا تھا۔ شام کو لوٹا تو تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی آتے سلیا سے بولا۔ لا کچھ پیسے دے تو دام لگاؤں۔ سلیا اسے دیکھتے ہی بآوازِ بلند رونے لگی

پیاگ۔ کیا ہوا؟ کیوں روتی ہے۔ کہیں گمی تو نہیں ہو گئی۔ باہر سے تو کوئی آدمی نہیں آیا؟

سلیا۔ اب میرا اس گھر میں رہنا نہ ہوگا۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔

پیاگ۔ ارے کچھ منہ سے تو بول۔ ہوا کیا۔ سنوں تو سہی۔ گاؤں میں کسی نے گالی دی ہے کسی نے کچھ کہا ہے؟ گھر پھونک تک دوں۔ اس کا چالان کروا دوں۔

سلیا نے رو رو کر سارا قصہ بیان کیا۔ پیاگ پر اس دن تھانے میں خوب جوتے پڑے تھے۔ جھلایا ہوا تھا ہی۔ یہ قصہ سنا تو بدن میں آگ لگ گئی۔ رُکمی پانی بھرنے گئی تھی وہ گھڑا بھی نہ رکھنے پائی تھی۔ کہ اس پر پل پڑا۔ اور مارتے مارتے بے دم کر دیا۔ وہ مار کا جواب گالیوں سے دیتی تھی۔ اور ہر ایک گالی پر وہ اور بھی جھلا جھلا کر مارتا تھا۔ یہاں تک کہ رُکمی کی گھٹنیاں پھوٹ گئیں۔ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سلیا بیچ بیچ میں اشتعال دیتی جاتی تھی۔ واہ رے دیدہ! واہ ری جبان! ایسی تو عورت ہی نہیں دیکھی عورت کاہے کو ڈائن ہے۔ ذرا بھی منہ میں لگام نہیں۔ پیاگ مارتے مارتے تھک کر الگ جا بیٹھا۔ پر رُکمی کی زبان نہ تھکتی تھی۔ بس اس کی زبان پر یہی رٹ لگی ہوئی تھی۔ تو مر

جا۔ تیری مٹی نکلے۔ تیری لاش نکلے۔ تجھے بھوانی کھائیں۔ تجھے مرگی آئے۔ پیاگ نہ رہ کر غصہ سے بے اختیار ہو جاتا۔ اور جا کر دو چار لاتیں جما لیتا۔ پر رکمنی میں غالباً اب حس ہی نہ تھا۔ وہ سر کے بال کھولے وہیں زمین پر بیٹھی اپنی منتروں کا جاپ کر رہی تھی۔ اس کے لہجہ میں اب غصہ نہ تھا۔ ایک مجنونانہ بے ساختگی تھی۔ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ انتقام کی آگ سے جل رہا تھا۔ اندھیرا ہوا تو رکمنی اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی۔ موہ کا آخری تار ٹوٹ گیا۔

(۴)

جب فصل تیاری کے قریب ہوتی تھی۔ تو ڈیڑھ دو مہینے پیاگ کو ہار کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اسے کسانوں سے دونوں فصلوں پر ہل پیچھے کچھ بندھا ہوا تھا۔ ماگھ ہی میں وہ ایک منڈیا ڈال لیتا تھا۔ اور رات کو کھانا کھا کر آگ۔ چلم تمباکو چرس لئے ہوئے اسی منڈیا میں آکر پڑ رہتا تھا۔ چیت کے آخر تک اس کا یہی شغل رہتا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا فصل پکی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ دو چار دن میں کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ پیاگ نے دس بجے رات تک رکمنی کی راہ دیکھی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ شاید کسی پڑوسن کے یہاں سو رہی ہوگی۔ اس نے کھانا کھا کر اپنی لاٹھی چلم آگ اُٹھائی۔ اور سلیا سے بولا۔ کواڑ بند کر لے اگر رکمنی آئے تو کھول دینا۔ کھانے کو کہنا۔ منا کر کچھ ضرور کھلا دینا۔ تیرے پیچھے آج اتنا تو جان ہو گیا آج نہ جانے مجھے اتنا غصہ کیسے آ گیا۔ میں نے اُسے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ کہیں ڈوب دھنس نہ مری ہو۔ نہیں تو کل آپھت آ جائے۔

سلیا بولی۔ نہ جانے وہ آئیں نہ آئیں۔ اکیلے کیسے رہوں گی۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے میں اکیلے گھر میں کبھی نہ رہی۔

پیاگ۔ تو گھر میں کون رہے گا۔ سونا گھر پا کر کوئی لوٹا تھالی اُٹھا لے جائے، تو؟ ڈر کس بات کا ہے۔ پھر رکمنی تو آتی ہی ہوگی۔

سلیانے ٹٹی اندر سے بند کر لی۔ پیاگ مزرعے کی طرف چلا۔ دم کے سرور میں ایک بھجن گاتا جاتا تھا۔ ٹھگنی کیوں نینا جھمکا وے۔ کدو کاٹ مردنگ بنائے۔ نیبو کاٹ مجیرا۔ پانچ ترو ٹی منگل گاویں۔ ناچیں بالم کھیرا۔ ٹھگنی۔ روپا پہر کے روپ دکھاوے سونا پہر رجھاوے۔ گلے ڈال تلسی کی مالا۔ تین لوک بھرماوے ٹھگنی۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ سامنے ہار میں کسی نے آگ جلائی۔ ایک شعلہ اٹھا۔ اس نے چلاکر پوچھا۔ کون ہے؟ ارے یہ کون آگ جلاتا ہے۔ اس کا جواب بلند ہونے والے شعلوں نے آتشیں زبان سے دیا۔ اب پیاگ کو معلوم ہوا۔ کہ اسکی منڈیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ منڈیا ہار کے بیچوں بیچ میں تھی۔ جس میں وہ سارے مزرعے پر مرکزی نگاہ ڈال سکے۔ اس منڈیا میں آگ لگنا روئی کے ڈھیر میں آگ لگنا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ منڈیا کے چاروں طرف ایک ہاتھ کے فاصلہ پر پکی ہوئی فصل کے تختے لہرا رہے تھے۔ اندھیری رات میں بھی اس کا سنہرا رنگ کچھ کچھ جھلک رہا تھا۔ آگ کی ایک لپٹ سارے ہار کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ اسی ہار سے ڈانڈے پاس پاس کے موضعوں کے ہار بھی ہیں۔ وہ بھی جل اٹھیں گے۔ اوہ شعلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ پیاگ نے اپلا اور چلم وہیں پٹک دی۔ اور کندھے پر کوہ بند لاٹھی رکھے ہوئے بے تحاشا منڈیا کی طرف دوڑا۔ مینڈوں سے جانے پر چکر تھا۔ وہ کھیتوں میں سے ہو کر بھاگا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ شعلے بلند تر ہوتے جاتے تھے۔ اور پیاگ کے قدم تیز تر۔ کوئی تیز گھوڑا بھی اس وقت اسے نہ پا سکتا۔ اسے خود اپنی تیزی پر حیرت ہو رہی تھی۔ جان پڑتا تھا۔ پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہیں۔ اسکی نظریں شعلوں پر تھیں۔ دائیں بائیں اسے اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ اس یکسوئی نے اسے مافوق البشر بنا دیا تھا۔ نہ دم پھولتا۔ نہ پیروں میں تھکن ہوئی۔ تین چار فرلانگ اس نے دو منٹ میں طے کئے۔ اور منڈیا کے پاس جا پہنچا۔ وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ شعلے شریر لڑکوں کی طرح ہنستے دھکم دھکا کرتے کبھی دائیں طرف لپکتے تھے کبھی

بائیں طرف۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لپیٹ اب کھیت تک پہنچی۔ گویا شعلے قصداً کیاریوں کی طرف بڑھتے اور ناکام ہو کر دوسری بار پھر دونے جوش سے لپکتے۔ یہ لاٹھی سے پیٹ کر آگ بجھانے کا موقعہ نہ تھا۔ وہ صریح حماقت تھی۔ پھر کیا ہو؟ فصل جل گئی تو پھر وہ منہ نہ دکھا سکے گا۔ اور گاؤں میں کہرام مچ جائیگا۔ تباہی آ جائے گی۔

دفعتہً اس نے لاٹھی سنبھال کر ایک چھلانگ ماری اور شعلوں کے اندر منڈیا کے دروازہ پر تھا۔ ایک ہی سیکنڈ میں ایک تختۂ آتشیں معلق ہوا میں ایک سمت کو اڑتا ہوا نظر آیا پیاگ نے جلتی ہوئی منڈیا کو اپنی لاٹھی پر اٹھا لیا تھا۔ اور اسے لئے ہوئے سب سے چوڑی مینڈ پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پھونس کی جلتی ہوئی دھجیاں اس کے اوپر گرتی جاتی تھیں پر اسے اس کا حس بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک موٹھا الگ ہو کر اس کے ہاتھ پر گرا۔ ادھر دھڑ کی کھال جھلس گئی۔ پر ہاتھوں میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ ہاتھ کا ہلنا کھیت کا تباہ ہونا تھا۔ نادر کی جنبش ابرو میں بھی شاید اتنی تباہ کن قوت نہ تھی۔ اگر خوف تھا تو یہی کہ وہ بیچ کا حصہ جہاں اس نے لاٹھی ڈال کر منڈیا اٹھائی تھی نہ جل جائے۔ ورنہ سوراخ کے بڑھتے ہی منڈیا اس کے اوپر آ گرے گی۔ اور وہ اس مزار آتشیں کے نیچے دب جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی فصل بھی تباہ ہو جائے گی اس لئے وہ خیال کے پرواز کے ساتھ اڑا جاتا تھا۔ چار فرلانگ کی دوڑ ہے۔ مرگ آتشیں پیاگ کے سر پر اڑتی چلی جا رہی ہے کس کے سر پر موت اس طرح کھیلی ہو گی۔ تیز رفتاری کے باعث شعلوں کا رخ پشت کی طرف ہو گیا ہے۔ اس کی قوت کا بیشتر حصہ ہوا کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہا تھا۔ ورنہ اب تک کا مرکزی حصہ جل گیا ہوتا اور پیاگ شعلوں کے نیچے دب جاتا۔

ایک فرلانگ طے ہو گیا۔ بس ایک فرلانگ کی اور کسر ہے۔

دیکھنا پیاگ! قدم ذرا بھی سست نہ ہوں۔ لاٹھی کے کندھے پر شعلے پہنچے اور تمہاری زندگی کا خاتمہ ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی تمہیں گالیاں ملیں گی۔ تم نالہ ہائے

سوناں کی آگ میں جلتے رہوگے۔ بس ایک منٹ اور صرف دو کھیت رہ گئے ہیں۔ آہ! منڈیا نیچے کھسک پڑی۔ گنّا اس کے سوراخ کے پار ہوگیا۔ اب کوئی اُمید نہیں شعلے ایک ایک انچ نیچے کی طرف کھسکتے آرہے ہیں۔ وہ آخری کھیت آپہنچا۔ اب صرف دو سیکنڈ کا اور معاملہ ہے۔ رنج کا دروازہ وہ سامنے بیس ہاتھ کے فاصلہ پہ ہے ادھر جنت ہے اُدھر جہنم۔ وہ منڈیا کھسکتی ہوئی پیاگ کے سر پہ آپہنچی۔ وہ اب بھی اُسے سر سے پھینک کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ مگر کب تک؟ ایک سیکنڈ میں وہ اس کی لاش پہ ہوگی۔ اور شعلے اس کے جسم پہ رقص کر رہے ہوں گے۔ اور کیا عجب ہے فصل کا میدان بھی ان کا رقص گاہ بن جائے۔ یکایک دُکھی سامنے درخت کے نیچے سے بے تحاشا دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے فوراً پیاگ کے سامنے آکر اس تحفۂ سوزاں کو دونوں ہاتھوں پر لے لیا۔ اور اسی وقت پیاگ بے ہوش زمین پر گر پڑا۔ دُکھی اس کاشانۂ سوزاں کو لئے ہوئے ایک ہی سیکنڈ میں آخری کھیت کے ڈانڈے پر جا پہنچی مگر اتنی ہی دُور میں اس کے ہاتھ جل گئے۔ اور جلتی ہوئی جھونپڑی اس کے سر پر گر پڑی۔ اور ایک لمحہ میں دُکھی شعلوں کا نوالہ بن گئی۔ کچھ دیر تک منڈیا کے نیچے جنبش ہوتی رہی۔ پھر سکوت ہوگیا۔ دُکھی اس مزارِ آتشیں میں دفن ہوگئی۔ ذرا دیر کے بعد گاؤں کے آدمی جمع ہوگئے۔ تو دیکھا پیاگ اس نیم سوختہ منڈیا کے سامنے سر جھکائے کھڑا آگ کو آنسوؤں سے بجھا رہا ہے۔ مگر اس کے اندر کی آگ کو کون بجھائے گا؟

— ٭ —

بڑے بابو

تین سو پینسٹھ دن کئی گھنٹے اور کئی منٹ کی متواتر پیہم مسلسل اور انتھک دوا دوش کے بعد بالآخر منزلِ مقصود پر دھڑ سے پہنچ گیا۔ بڑے بابو کی زیارت حاصل ہوگئی۔ کرۂ خاکی نے کرۂ آتشیں کا طواف پورا کر لیا۔ اب تو آپ بھی میرے جغرافی تجربے کے قائل ہوگئے ہونگے۔ اِسے استفادہ نہ سمجھئے گا۔ بڑے بابو میں مہر نیمروز کی تابش، تجلی اور حرارت تھی۔ اور میں کیا اور میری بساط کیا۔ ایک مشتِ خاک۔ بڑے بابو مجھے دیکھ کر مسکرائے ہائے وہ تبسم پُر جلال میرے تنِ نیم جان میں رعشہ سا آگیا۔ جی میں آیا بڑے بابو کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ میں کافر نہیں۔ غالب کا مُرید نہیں۔ جنت کے وجود پر مجھے یقین کامل ہے اتنا ہی کامل جتنا اپنے خانۂ تاریک پر۔ لیکن فرشتے مجھے جنت لے جانے کے لئے آتے تو بھی یقیناً مجھے وہ مسرت بیکراں نہ حاصل ہوتی۔ جو اس تبسم پُر نور سے ہوئی۔ آنکھوں میں سرسوں پھول گئی۔ سارا دل و دماغ لالہ زار بن گیا۔ تخیل نے مصری اہرام کی تعمیر شروع کر دی سامنے کرسیوں پردوں اور خس کی ٹٹیوں سے سجا سجایا کمرہ تھا۔ دروازہ پر سائلوں کا انبوہ کثیر۔ دائیں جانب ایک کرسی پر شان سے بیٹھے ہوئے قسّام ازل کے دُنیاوی فرائض ادا کر رہے تھے۔ نذر و نیاز کا طوفانِ بدتمیزی بپا تھا۔ اور میں شانِ استغنا سے کسی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ دفعتہً ایک شیرانہ گرج نے زیرِ تعمیر اہرام کو متزلزل کر دیا۔ کیا کام ہے ہائے تجاہل۔ اس پر ساری دُنیا کے حسینوں کا تجاہل اور تغافل نثار۔ اس آستانۂ دولت پر جبیں سائی کرتے۔ تین سو پینسٹھ دن کئی گھنٹے اور کئی منٹ گزر گئے۔ چرخ کھٹ زمین دوز ہو گیا عید و بساطی کی دُکان کے آدھے کھلونے اور گوردھن حلوائی کی آدھی دُکان اسی آستانہ پر

نند ہو گئی اور مجھ سے آج سوال ہوتا ہے کہ کیا کام ہے؟

مگر نہیں یہ میری زیادتی ہے۔ سراسر ظلم ہے۔ جو فکرِ عالی اہم مُلکی و مالی تمدنی معاملات میں شبانہ روز منہمک رہتی ہو۔ جو دماغ ڈائریوں سرکلروں۔ پروانوں حکمناموں نقشوں وغیرہ سے گرانبار ہو رہا ہو۔ اس کے نزدیک مجھ جیسے خاک کے پُتلے کی حقیقت ہی کیا۔ مچھر اپنے کو چاہے ہاتھی سمجھ لے پر بیل کے سینگ کو اس کی کیا خبر۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ حضور کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا۔

بڑے بابو پھر گرجے۔ "کیا کام ہے۔"

اب کی بار میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خدا کے فضل سے لحیم شحیم آدمی۔ جن دنوں کالج تھا۔ میری شجاعت و بسالت کی دھوم تھی۔ ہاکی ٹیم کا کپتان چھ فٹ لمبا ٹیم کا نائب کپتان اور کرکٹ کا جرنل تھا۔ کتنے ہی گوروں کے جسم پر اب بھی میری شجاعت کے داغ باقی ہوں۔ ممکن ہے دو چار اب بھی بیساکھیاں لئے چلتے یا رینگتے ہوں۔ بمبئی کرانیکل اور ٹائمز میں میرے گیندوں کی دھوم تھی۔ مگر اس وقت بابو صاحب کی گرج سُن کر میرے جسم میں رعشہ سا آگیا۔ کانپتے ہوئے بولا۔ حضورؐ کی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا۔

بڑے بابو نے اپنا سلیپر دار پیر میری طرف بڑھا کر کہا۔ شوق سے لیجئے یہ قدم حاضر ہے جتنے بوسے چاہئے لے لیجئے۔ بے حساب معاملہ ہے۔ مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں شمار کروں۔ جب تک آپ کا مُنہ نہ تھک جائے لئے جائیے۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کا کیا موقعہ ہوگا۔ اوروں کی جو بات بڑی ریاضت بڑی چلہ کشی بڑے زہد و اتقا سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ مجھ بیٹھے بٹھائے بغیر ہڑ پھٹکری لگائے حاصل ہو گئی واللہ ہوں میں بھی خوش نصیب۔ آپ اپنے دوست احباب۔ اعزہ و اقربا کو بھی لائیے تو اور بھی بہتر۔ میرا اذن عام ہے۔

اس ستم ظریفی پر بڑے بابو شائد اپنے دل میں نازاں ہوں ضرور ہونگے اس شوخی

تقدیر کا بنا ہو۔ جو اس دروازہ کا گداگر بنائے ہوئے ہے۔ جی میں آیا کہ حضرت کے بڑھے ہوئے پیر کو کھینچ لوں۔ ادر آپ کو زندگی بھر کے لئے سبق دیدوں کہ بدنصیبوں سے دل لگی کرنے کا یہ مزہ ہے۔ مگر بدنصیبی اگر دل پر جبر نہ کرائے۔ جذبات کا قتل نہ ہو جائے۔ ذلت کا احساس نہ پیدا کرے تو وہ بدنصیبی کیوں کہلائے۔ میں بھی ایک زمانے میں ستم ظریف تھا اس وقت ان بڑے بابوؤں کی میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ کتنے ہی بڑے بابوؤں کو رلا کر چھوڑ دیا کوئی ایسا پروفیسر نہ تھا جس کا چہرہ میری صورت دیکھتے ہی زرد نہ ہو جاتا ہو۔ ہزار ہزار روپیہ پانے والے پروفیسروں کی مجھ سے کور دبتی تھی۔ ایسے کلرکوں کو میں سمجھتا ہی کیا تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ کہاں۔ دل میں پچھتایا کہ ناحق قدمبوسی کا لفظ زبان پر لایا۔ مگر عرض مدعا ضروری تھا۔ میں مصمم ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس در سے آج کچھ لے کے ہی اٹھوں گا۔ میرے صبر و در بڑے بابو کے تحمل میں ٹھگ آنے والا تھا۔ دبی آواز سے بولا۔ حضور گریجوایٹ ہوں۔

شکر ہے ہزار شکر ہے۔ بڑے بابو نے جیسے ہانڈی ابل پڑی ہو۔ وہ گنج اور وہ کرخت آواز نہ تھی۔ میری جبہ سائی آخر کہاں تک اثر نہ کرتی۔ شاید ان کو میری دعا سے دشمنی نہیں۔ میرے کان بڑی بے قراری سے کلمات مدح افزا سننے کے لئے منتظر تھے۔ مگر آہ جیسی مایوسی ان کانوں کو ہوئی ہے۔ اتنی شاید کوہکن کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ تبسم نہ تھا۔ خندۂ تقدیر تھا۔ حضور نے فرمایا۔

بڑی خوشی کی بات ہے۔ ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا کیا امر ہو سکتا ہے میری دلی تمنا ہے۔ ملک کا ہر ایک نوجوان گریجوایٹ ہو جائے۔ گریجوایٹ زندگی کے جس شعبہ میں جائے اس کو فروغ ہی پہنچائے گا۔ ملکی مالی تمدنی معاشرتی مذہبی غرض ہر ایک قسم کی تحریک کی بقا اور ارتقا گریجوایٹوں پر منحصر ہے۔ اگر ملک میں گریجوایٹوں کا یہ افسوسناک فقدان نہ ہوتا تو عدم تعاون کی تحریک کیوں اتنی جلدی مردہ ہو جاتی کیوں بنے

ہوئے رنگے ہوئے سیار۔ جو فروش گندم نما زر پرست لیڈروں کو ڈاکہ زنی کے ایسے مواقع ملتے۔ تبلیغ کیوں مبلغ علیہ السلام کی علت بنتی۔ گریجوایٹ میں حق و باطل کی تمیز نگاہ کی وسعت اور موازنہ کی قابلیت ہونا امر لازم ہے۔ میری آنکھیں تو گریجوایٹوں کو دیکھ کر فرشتہ کے درجہ تک محفوظ ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی خدا کے فضل سے اپنی قسم کی بہت اچھی مثال ہیں۔ بالکل اپ ٹو ڈیٹ۔ یہ شیروانی تو برکت اینڈ کو کی دکان کی سلی ہوئی ہوگی۔ جوتے بھی ڈاسن کے ہیں۔ کیوں نہ ہو آپ لوگوں نے قوم کے معیار زندگی کو بہت رفیع بنا دیا ہے۔ اور اب وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچے گی۔ بلیک برڈ بھی ہے ویسٹ اینڈ کی رسٹ واچ بھی ہے۔ بے شک اب قومی بیڑے کو خواجہ خضر کی ضرورت ہی نہیں وہ اس کا منت شناس نہ ہوگا۔

ہائے تقدیر، اور وائے تقدیر۔ اگر جانتا کہ یہ شیروانی، عدہ فاؤنٹن پن اور رسٹ واچ یوں آماجگاہ ظرافت بنے گی تو احباب کا شرمندۂ احسان کیوں بنتا۔ نماز بخشوانے آیا تھا روزے گلے پڑے۔ کتابوں میں پڑھا تھا۔ ہیئت کذائی اعلان ہے اپنی ناکامی کا۔ دعوت ہے اپنی تحقیر کی۔ تجربہ بھی مطالعہ کا شاہد تھا۔ چیتھڑے پوش بھک منگوں کو کتنی بے دردی سے دھتکارتا ہوں لیکن جب کوئی حضرت صوفی صافی بنے ہوئے گیسو دراز شانوں پر بکھیرے سبز عمامہ سر پر شان کج کلاہی سے باندھے صندلی رنگ کا نیچا کرتہ پہنے کمرہ میں آ پہنچتے ہیں تو جبراً ان کی تعظیم کرنی پڑتی ہے اور وہ ان کی پاک منشی کے متعلق ہزاروں اشتباہات پیدا ہونے پر بھی چھوٹی سی چھوٹی رقم جو ان کی نذر کی جاتی ہے۔ وہ ایک درجن بھکاریوں کو خوان نعمت کے سامان مہیا کر دیتی۔ پرانی مثل ہے بھیس ہی بھیک ملتی ہے۔ پر آج اس کہاوت کی تکذیب ہو گئی ہے اب اہلیہ محترمہ کی وہ تنبیہ یاد آئی جو اس نے چلتے وقت کی تھی۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی بے عزتی کرانے جا رہے ہو۔ وہ صاف سمجھیں گے کہ یہ مانگے تانگے کا ٹھاٹھ ہے۔ ایسے رئیس ہوتے تو میرے دروازے پر آتے ہی کیوں۔ اس وقت میں نے اس تنبیہ کو اہلیہ کی کم نگاہی اور

دہقانیت پر محمول کیا تھا۔ پر اب معلوم ہُوا کہ گنوار بھی کبھی کبھی سُوجھ کی باتیں کہتے ہیں مگر اب دست تاسف ملنا بے سُود ہے۔ میں نے عاجزانہ انداز سے کہا حضور میری پرورش فرمائیے۔ بڑے بابو نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا میں کوئی عجیب الخلقت وجود ہوں اور نہایت تشفی آمیز لہجہ میں بولے آپ کی پرورش خدا کریگا۔ وُہی سب کا رازق ہے۔ ازل سے شعراء حکماء و اولیاء یہی تلقین کرتے آئے ہیں۔ کہ خدا پر توکل رکھو۔ اور ہم ہیں کہ اُن کی ہدایت کو فراموش کر جاتے ہیں۔ لیکن خیر میں آپ کو صلاح نیک دینے میں بخل نہ کروں گا۔ آپ ایک اخبار نکال لیجئے۔ یقین مانئے اس کے لیے علمیت یا تدبر کی ضرورت نہیں آپ تو خدا کے فضل سے گریجوایٹ ہیں۔ حبوب امساک اور لمنذو طلاء کے نسخے لکھئے۔ طب اکبر میں آپ کو ہزاروں نسخے ملینگے لائبریری جا کر نقل کر لائیے اور اخبار میں نئے عنوان سے شائع کیجئے۔ کوک شاستر کا تو آپ نے مطالعہ کیا ہی ہوگا۔ اگر نہ کیا ہو تو ایک بار کر دیجئے۔ اور اپنے اخبار میں لطف مواصلت کے طریقے ارقام فرمائیے اعضاء شہوانی کے نام جتنے زیادہ آئیں بہتر ہے۔ پھر دیکھئے کیسے ڈاکٹر اور پروفیسر اور ڈپٹی کلکٹر آپ کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال رہے کہ یہ کام حکیمانہ انداز سے کیا جائے تاجرانہ اور حکیمانہ انداز میں تھوڑا فرق ہے۔ تاجر محض اپنی دواؤں کی تعریف کرتا ہے۔ حکیم اصطلاحات اور اعضاء مخفی کی تشریح کر کے اپنے مضامین کو علمی رنگ دیتا ہے تاجر کی تعریف سے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ حکیم کی تعریف اعتماد انگیز ہوتی ہے اگر اس معاملہ میں کچھ استصواب کی ضرورت ہو تو رسالہ "درویش" حاضر ہے۔ اگر اس کام میں آپ کو کچھ دِقت معلوم ہو۔ تو سوامی شردھانند کی خدمت میں جا کر شُدھی پر آمادگی ظاہر کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کتنی تواضع اور تکریم ہوتی ہے۔ اتنا سمجھائے دیتا ہوں کہ شُدھی کے لئے فوراً تیار نہ ہو جائیے گا۔ پہلے دن تو دو چار ہندو دھرم کی کتابیں مانگ لائیے گا۔ ایک ہفتہ کے بعد جا کر کچھ اعتراضات کیجئے گا۔ مگر اعتراضات ایسے ہوں جن کا جواب آسانی سے دیا جا سکے اس سے سوامی جی کو آپ کی تحقیق اور تجسس کا یقین ہو جائے گا۔ بس آپ کی چاندی ہے

آپ اس کے بعد اسلام کی مخالفت پر ایک دو مضمون یا سلسلۂ مضامین کسی ہندو رسالہ میں لکھ دیں گے۔ تو آپ کی زندگی اور معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے بھی ایک سہل نسخہ ہے۔ تبلیغی مشن میں تحریک ہو جائیے۔ کسی ہندو عورت خصوصاً نوجوان بیوہ پر ڈورے ڈالیے آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ کتنی آسانی سے آپ سے ملتفت ہو جاتی ہے۔ آپ اسکی حیاتِ تاریک کے لئے مشعل ثابت ہوں گے۔ وہ بے عذر ہوتی ہے۔ شوق سے اسلام قبول کرلے گی۔ بس آپ شہیدوں میں داخل ہو گئے۔ اگر آپ ذرا احتیاط سے کام کرتے رہیں۔ تو آپ کی زندگی بڑی فارغ البالی سے گذرے گی۔ ایک ہی کھیوے میں دین و دنیا دونوں ہی پار ہیں۔ جناب لیڈر بن جائیں گے واللہ ایک ہفتہ میں آپ کا شمار معززین میں ہونے لگیگا۔ دین کے سچے پیرو ہزارہا سیدھے سادے مسلمان آپ کو دین کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا سمجھیں گے۔ پھر خدا کے سوائے اور کسی کو خبر ہوگی کہ آپ کے ہاتھ کیا آتا ہے۔ اور وہ کہاں جاتا ہے۔ اور خدا افشائے راز نہیں کرتا۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں۔ تعجب ہے کہ ان موقعوں پر آپ کی نگاہ کیوں نہیں جاتی۔ میں تو بوڑھا ہو گیا اور ابکوئی نیا کام نہیں سیکھ سکتا۔ ورنہ اس وقت لیڈروں کا لیڈر ہوتا۔

اس شعلہ انگیز شرافت نے جسم میں شعلے پیدا کر دیئے۔ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ تحمل کی برودت حائل بخیر ہو گئی۔ مگر قہر درویش برجان درویش کے مصداق سر جھکا کر کھڑا رہا۔ جتنی دلیلیں ذہن میں کئی دنوں سے ریزہ ریزہ کرکے رکھی تھیں حرف اظہار ہو گئیں۔ بہت سوچنے پر بھی کوئی نیا پہلو ذہن نہ آیا۔ یوں خدا کے فضل سے غبی یا کند ذہن نہیں ہوں۔ فکر رسا پائی ہے اتنی فکر سے کوئی اچھی سی غزل ہو جاتی پر طبیعت ہی تو ہے نہ لڑی۔ اتفاق سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معاً یاد آگیا کہ سفارشی خطوط کا ایک دفتر بھی ساتھ لایا ہوں۔ رعب کا اوسان پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا آج تجربہ ہو گیا۔ امید کی شگفتگی چہرہ پر نمودار ہو گئی۔ خطوط کا پلندہ ہاتھ میں لے کر بولا۔ حضور! یہ چند خطوط ہیں۔ انہیں ملاحظہ فرمالیں۔

بڑے بابو نے بنڈل لے کر میز پر رکھ دیا اور ان پر ایک غلط انداز نظر ڈال کر بولے

آپ نے اب تک ان جواہر ریزوں کو کہیں چھپا رکھا تھا؟

میرے دل میں مسرت امید کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گویائی نے عود کیا۔ اُمنگ سے بولا۔ حضور کے جاہ و جلال نے تو شاہی رعب اور مسحور کر دیا کہ مجھے ان خطوط کی یاد نہ رہی حضور سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے اُن کے لئے کسی قسم کی سعی و سفارش نہیں بہم پہنچائی۔ کسی قسم کی جستجو نہیں کی۔

بڑے بابو نے مسکرا کر فرمایا اگر آپ ان کے لئے سعی و طلب کی انتہائی کوشش صرف کرتے تو بھی میں آپ کو متہم نہ کرتا۔ آپ بے شک بڑے خوش نصیب ہیں کہ یہ نایاب . . . جنس آپ کو بے مانگے مل گئی۔ اسے زندگی کے سفر کا پاسپورٹ سمجھئے واہ آپ کو خدا کے فضل سے ایک سے ایک قدردان نصیب ہوئے۔ آپ ذہین ہیں۔ راستباز ہیں۔ بے لوث ہیں۔ اطاعت شعار ہیں۔ اُفوہ! آپ کے اوصاف کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ قسم خدا کی آپ جامع کمالات صوری معنوی معلوم ہوئے ہیں۔ آپ میں فراست۔ متانت۔ دیانت۔ حیا۔ نتد۔ اصابت نجابت۔ شرافت۔ طہارت سبھی انسانی اور ملکوتی صفات موجود ہیں۔ آپ تو نمائش میں دکھے جانے کے قابل معلوم ہوتے ہیں۔ کہ دُنیا نگاہ حیرت سے دیکھے اور دانتوں میں اُنگلی دبائے۔ آج کسی بھلے کا مُنہ دیکھ کر اُٹھا تھا۔ کہ آپ جیسے پاکیزہ منش شخص سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ یہ وہ اوصاف ہیں۔ جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں آپ کو نام و نمود کے مدارج تک پہنچا سکتے ہیں۔ سرکار کی ملازمت آپ جیسے باکمال اصحاب کے شایانِ شان نہیں۔ آپ کو یہ کب گوارا ہوگا۔ اس دائرہ میں آتے ہی انسان حیوان مطلق بن جاتا ہے۔ بولئے آپ اسے منظور کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں ——!

میں نے ڈرتے ڈرتے۔ جناب ذرا ان الفاظ کی توضیح فرمائیے۔ انسان کے حیوان مطلق بننے سے آپ کا کیا منشا ہے۔؟

بڑے بابو نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ یہ تو کوئی ایسا پیچیدہ توضیح طلب امر نہ تھا۔ جب

تو مجھے اپنے حسن ظن میں کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔ اس دائرہ کے عبودیت کیشوں کیلئے سب سے ضروری اور لازمی صفت فراست ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے خیال پر یہ لفظ قادر ہے یا نہیں اس کا انگریزی مترادف ہے۔ انٹیوشن۔ شاید کہ اصلی مفہوم کو سمجھا سکے مثلاً اگر سرکار بہادر یعنی حاکم ضلع کو شکایت ہو کہ آپ کے علاقہ میں انکم ٹیکس کم وصول ہو رہا ہے تو آپکا فرض ہے کہ اس میں اندھا دھند اضافہ کریں؟ آمدنی کی پرواہ نہ کریں۔ آمدنی کا بڑھانا آپ کی خاطر ہی پر منحصر ہے۔ ایک خفیف سی دھمکی کام کر جائے گی اور انکم ٹیکس دو چند سہ چند ہو جائے گا۔ یقیناً آپ کو یہ ضمیر فروشی گوارا نہ ہوگی۔

میں نے سمجھ لیا کہ میرا امتحان ہو رہا ہے۔ عاشقانہ سرگرمی سے بولا۔ میں تو اسے ضمیر فروشی نہیں سمجھتا۔ یہ تو حق نمک ہے۔ میرا ضمیر اس قدر نازک نہیں ہے۔

بڑے بابو نے میری طرف قدر دان نگاہ سے دیکھ کر فرمایا۔

شاباش! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ آپ مجھے ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شاید دوسری شرط آپ کو منظور نہ ہو۔ اس دائرہ کے مریدوں کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے کو بھول جائیں۔ کچھ آیا ذہن شریف میں؟

میں نے دبی زبان سے کہا جناب کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر ذرا پھر اسکی توضیح فرما دیجئے

بڑے بابو نے بے چین ہو کر کہا۔ جناب بار بار کی توضیح مجھے بری معلوم ہوتی ہے میں اس سے زیادہ آسان طریقہ پر اپنے خیال کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اپنے کو بھول جانا بہت ہی عام محاورہ ہے۔ اپنی خودی کو مٹا دینا اپنی شخصیت کو فنا کر دینا ہے۔ اپنی پرسنیلٹی کو زائل کر دینا۔ آپ کی وضع قطع سے آپ کے خطاب و کلام سے آپ کے انداز و اطوار سے آپ کی ہندیت کی تکذیب ہو جانی چاہئے۔ آپ کے مذہبی اخلاقی اور تمدنی اثرات کا ایک قلم محو ہو جانا ضروری ہے مجھے آپ کے بشرہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اس توضیح پر بھی آپ میرا مفہوم سمجھنے پر قاصر ہیں۔ سنئے آپ غالباً مسلمان ہیں۔ شائد آپ راسخ العقیدہ بھی ہوں

آپ نماز اور روزے کے پابند ہیں؟

میں نے انداز تغافل سے کہا۔ جناب میں اتنا ہی راسخ العمل ہوں جتنا کوئی مولوی ہو سکتا ہے۔ میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ الا اس وقت جب میں بستر علالت پر تھا۔

بڑے بابو نے مسکرا کر کہا۔ یہ آپ کے پسندیدہ اخلاق ہی کہے دیتے ہیں۔ مگر اس دائرہ میں آکر آپ کو اپنے عقیدہ اور عمل میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنی پڑے گی یہاں آپ کا مذہب مذہبیت کا خاصہ اختیار کرے گا۔ آپ بھول کر بھی اپنی پیشانی کو منت کش سجدہ نہ بنائیں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ بھول کر بھی زکوٰۃ سے اپنے کو ملوث نہ بنائیں کوئی مضائقہ نہیں لیکن آپ کو اپنے مذہب کے نام پر فریاد کرنے کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ کے ضلع میں دو ڈپٹی کلکٹر ہندو ہیں۔ اور مسلمان صرف ایک تو آپ کا فرض ہے کہ زعیمانِ قوم کو اس میونسپلٹی کی سرزنش کرنے کے لئے تحریک کریں۔ آپ کو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے قومی فدائیت کا راگ الاپنا چاہیئے* مثلاً امتحان کے نتائج میں اگر آپ کو مسلمان طلباء کی تعداد مناسب سے کم نظر آئے۔ تو آپ کو فوراً چانسلر کے پاس ایک گمنام خط لکھ کر بھیجنا ہوگا۔ کہ اس معاملہ میں ضرور ہی سختی سے کام لیا گیا ہے یہ ساری باتیں اسی انسٹیٹیوشن والی شرط کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ آپ کو صراحتہً یا کنایتہً یہ لائحہ عمل قائم کرنے کے لئے ہدایت نہ کی جائے گی۔ سب کچھ آپ کی فراست پر مبنی ہوگا۔ آپ نے اس جوہر سے بہرہ وافی پایا ہے۔ تو آپ کو ایک دن ضرور منصب اعلیٰ پر پہنچیں گے۔ آپ کو حتی الامکان انگریزی میں تحریر و تقریر کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر حکام آپ سے خوش نہ ہوں گے۔ لیکن قومی زبان کی حمایت اور اشاعت کی صدا آپ کی زبان سے پیہم نکلتی رہنی چاہیئے۔
آپ شوق سے اخبارات کا چندہ ہضم کریں۔ مستعار کتابیں پڑھیں چاہے واپسی کے وقت

---

* ہز ایکسیلنسی گورنر کی خدمت میں ایک وفد بھیجنے کے لئے رؤسائے قوم کو آمادہ کریں اگر آپ کو معلوم ہو کر کسی میونسپلٹی نے قصابوں کو شہر سے باہر دکان رکھنے کی تجویز پاس کر دی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ

کتاب کی قلب ہئیت کے باعث آپ کو معذرت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ لیکن زبان کی حمایت بانگ دہل سے کرتے رہئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو جس کا کھانا اسی کا گانا ہوگا۔ آپ کے قول سے۔ فعل سے اور دل سے اپنے آقا کے فلاح اور استحکام میں منہمک ہونا پڑے گا۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آقا کی خدمت کے ذریعہ قوم کی خدمت بھی کروں گا۔ تو یہ خیال خام ہے۔ سودا ہے۔ جنوں ہے۔ حماقت ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ فرمائیے آپ اس حد تک اپنے کو بدل سکتے ہیں۔

مجھے جواب دینے میں ذرا تامل ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ میں بھی آدمی ہوں اور بیسویں صدی کا آدمی ہوں۔ میں بیدار نہ سہی۔ مگر بالکل غافل بھی نہیں ہوں۔ میں بھی اپنے ملک اور قوم کو بام عروج پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب دنیا میں صرف ایک ہے۔ اور اس کا نام ہے درد۔ مذہب کی موجودہ صورت دھڑے بندی کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی ختنہ یا چوٹی سے کسی کی ماہیت نہیں تبدیل ہو سکتی۔ پرستش کے لئے کلیسا۔ مسجد۔ مندر کی میں بالکل ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہاں نفسانیت اور انانیت کو دبائے رکھنے کے لئے کسی عمل کی ضرورت تسلیم کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ اس سے مجھے جنت ملے گی یا میری مکتی ہوگی بلکہ صرف اس لئے کہ مجھے دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے اکراہ ہوگا۔ مجھ میں خودی کا خاصہ عنصر موجود ہے۔ یوں اپنی رضا و رغبت سے کہئے آپ کی جوتیاں سیدھی کردوں لیکن حکومت کی برداشت نہیں۔ محکوم بننا شرمناک۔ حقارت انگیز سمجھتا ہوں۔ کسی غریب کو ظلم کا شکار ہوتے دیکھ کر میرے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی سے دب کر رہنے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن خیال حالات پر تو فتح نہیں پا سکتا۔ معاش کی فکر تو مقدم ہے۔ اتنے دنوں کے بعد بڑے بابو کی نگاہ کرم کو اپنی جانب ملتفت دیکھ کر بجز سر تسلیم خم کرنے کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ بولا جناب میری جانب سے مطمئن رہیں۔ آقا کی خدمتگذاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔

"حمیت کو فنا کر دینا ہوگا۔"

"منظور"

"شرافت کے جذبات کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔"

"منظور"

"مخبری کرنی پڑے گی۔"

"منظور"

"تو بسم اللہ کل سے آپ کا نام امیدواروں کی فہرست میں لکھ دیا جائے گا۔"

میں نے سوچا تھا کل سے کوئی جگہ مل جائے گی۔ اتنی ذلت قبول کرنے کے بعد معاش کی فکر سے تو آزادی نصیب ہوگی۔ اب حقیقت کھلی۔ بے اختیار منہ سے نکلا اور جگہ کب تک ملے گی؟

بڑے بابو ہنسے۔ وہی دلخراش ہنسی جس میں ذم کا پہلو غالب تھا۔ جناب میں عالم الغیب نہیں۔ روشن ضمیر نہیں۔ بہتر ہو۔ اس سوال کا جواب آپ کسی اولیا سے پوچھیں دسترخوان بچھا دینا میرا کام ہے۔ کھانا آئے گا اور وہ آپ کے حلق میں جائے گا۔ پیشین گوئی میں نہیں کر سکتا۔ میں نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ میں تو صرف اس سے بڑی عنایت کا منتظر تھا۔ بڑے بابو کرسی سے اٹھ کر بولے۔ قسم خدا کی آپ پرلے درجے کے کوڑمغز آدمی ہیں۔ بالکل خشک دماغ۔ دسترخوان کا سامنے آجانا۔ آپ کوئی چھوٹی بات سمجھتے ہیں لطف انتظار آپ کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں حالانکہ انتظار میں انسان عمریں گزار سکتا ہے۔ آپ روزانہ کچہری میں آئیں گے۔ غرضمندوں سے آپ کا سابقہ ہوگا۔ عملے سے آپ روشناس ہو جائیں گے۔ معاملے بگاڑنے سودے پٹانے کے زریں موقعے ہاتھ آئیں گے۔ حکام کے لڑکے پڑھائیے اگر گنڈے تعویذ کا فن سیکھ لیجئے۔ تو آپ کے حق میں بہت مفید ہو۔ کچھ طبی معلومات بھی بہم پہنچائیے۔ اچھے ہوشیار نٹوں سے یارانہ پیدا کیجئے۔ کیونکہ آپ کو ان سے اکثر سابقہ

پڑے گا۔ حکام کی مستورات آپ ہی کی معرفت اپنی نسوانی فرمائشیں پوری کرائیں گی۔ مگر ان سب تکلفوں سے کام لینا ایک اور ہی ڈھنگ ہے۔ اگر وہ ہنر آپ میں ہے تو یقیناً آپ کے انتظار کی مدت میں بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔ آپ حکام عالی مقام کے لیے سامانِ تفریح مہیا کر سکتے ہیں؟

بڑے بابو میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرائے۔ سامانِ تفریح سے ان کی کیا مراد ہے۔ یہ میں نہ سمجھ سکا۔ مگر پوچھتے ہوئے بھی خوف ہوتا تھا کہ کہیں بڑے بابو بگڑ نہ جائیں اور پھر معاملہ خراب ہو جائے۔ ایک اضطراب کی حالت میں زمین کی طرف تاکنے لگا۔ بڑے بابو تاڑ گئے کہ اس کی سمجھ میں میری بات نہ آئی۔ لیکن اب کے وہ چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ بلکہ ان کے لہجے میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ فرمایا۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ آپ نے بازار کی سیر نہ کی ہو۔

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ نہیں حضور! بندہ اس کوچہ سے نا آشنا ہے۔

بڑے بابو بولے تو آپ کو اس کوچے کی خاک چھاننی پڑے گی۔ حکام بھی باصرہ اور سامعہ رکھتے ہیں۔ دن بھر کی دماغی تکان کے بعد فطرتاً شب کو ان کی طبیعت تفریح کی جانب مائل ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے لیے حسن باصرہ فروز اور نغمہ سامعہ نواز کا انتظام سستے داموں کر سکتے ہیں۔ یا کر سکیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔ آپ کا منشا یہ ہے کہ مجھے بازار حسن کی دلالی کرنی پڑے گی؟ بابو صاحب بولے تو آپ تیز کیوں ہوتے ہیں۔ اگر اب تک اتنی موٹی سی بات آپ نہیں سمجھے تو یہ میرا قصور ہے۔ یا آپ کی کوتاہ فہمی کا؟

میرے جسم میں آگ لگ گئی۔ جی میں آیا کہ بڑے بابو کو جوجٹسو کے دو چار ہاتھ دکھاؤں مگر گھر کی بے سروسامانی کا خیال آ گیا۔ بیوی کی منتظر آنکھیں اور بچوں کی گرسنہ صورتیں یاد آ گئیں۔ ذلت کا ایک دریا حلق کے نیچے ڈھکیلتے ہوئے بولا۔ جی نہیں۔ میں تیز نہیں

ہوا تھا۔ ایسی بے ادبی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) حضرت
نے میری غیرت کو فنا کر دیا ہے۔ آپ میرا نام اُمیدواروں میں درج کر دیں۔
حالات مجھ سے جو کچھ کرائیں گے۔ وہ سب کروں گا۔ اور تا دمِ آخر آپ کا ممنون رہوں
گا ؎

عجیب ہولی

(۱)

ہولی کا دن تھا۔ مسٹر اے۔ بی کراس شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ سائیس، اردلی، مہتر، بہشتی، گوالا، دھوبی سب ہولی منا رہے تھے۔ سبھوں نے صاحب کے جاتے ہی خوب گہری بھنگ چڑھائی تھی۔ اور اس وقت باغیچہ میں بیٹھے ہوئے خوب پھاگ گا رہے تھے۔ لیکن رہ رہ کر بنگلہ کے پھاٹک کی طرف جھانک لیتے تھے۔ کہ صاحب آ تو نہیں رہے ہیں۔ اتنے میں شیخ نورعلی آکر سامنے کھڑے ہو گئے۔

سائیس نے پوچھا۔ کہو خانساماں جی۔ صاحب کب آئیں گے۔

نورعلی بولا۔ اس کا جب جی چاہے آئے۔ میرا آج سے استعفا ہے۔ اب اس کی نوکری نہ کروں گا۔

اردلی نے کہا۔ ایسی نوکری نہ پاؤ گے پھر۔ چار پیسے اوپر کی آمدنی ہے۔ ناحق چھوڑتے ہو۔

نورعلی۔ اجی لعنت بھیجو۔ اب مجھ سے غلامی نہ ہوگی۔ یہ ہمیں جوتوں سے ٹھکرائے اور ہم اس کی غلامی کریں۔ آج یہاں سے ڈیرا کوچ ہے۔ آؤ تم لوگوں کی دعوت کروں۔ چلو آؤ کمرے میں۔ آرام سے میز پر ڈٹ جاؤ۔ وہ وہ بوتلیں پلاؤں کہ کلیجہ تر ہو جائے۔

سائیس۔ اور جو کہیں صاحب آ جائیں؟

نورعلی۔ وہ ابھی نہیں آئے گا۔ چلے آؤ۔

صاحبوں کے ملازم عموماً شرابی ہوتے ہیں۔ جس روز سے صاحب کے یہاں غلامی کا پٹہ لکھا۔ اسی روز سے یہ بلا ان کے سر پڑ جاتی ہے۔ جب مالک خود بوتل کی بوتل انڈیل

جاتا ہو۔ تو بھلا نوکر کہیں کچھ کہنے لگے۔

یہ دعوت پاکر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ بھنگ کا نشہ چڑھا ہی ہوا تھا۔ ڈھول مجیرے چھوڑ چھاڑ کر نور علی کے ساتھ چلے اور صاحب کے کھانے کے کمرے میں کرسیوں پر جا بیٹھے نور علی نے وسکی کی بوتل کھول کر گلاس بھرے اور چاروں نے ڈھالنا شروع کر دیا۔ بھنگ پینے والوں نے جب یہ مزیدار چیز پائی تو گلاس پہ گلاس چڑھانے لگے۔ خانساماں بھی حوصلہ افزائی کرتا جاتا تھا۔ ذرا دیر میں سبھوں کے سر پھر گئے۔ خوف جاتا رہا۔ ایک نے پھاگ چھیڑا دوسرے نے سر ملایا اور گانے ہونے لگے۔ نور علی نے ڈھول مجیرا لاکر رکھ دیا۔ وہیں مجلس جم گئی۔ گاتے گاتے ایک اُٹھ کر ناچنے لگا۔ دوسرا اُٹھا۔ یہاں تک کہ سب کے سب کمرہ میں چوکڑیاں بھرنے لگے۔ ہو حق مچنے لگا۔ کبیر۔ پھاگ۔ چوتالا۔ گالی گلوچ ادیبا غرض باری باری سب کا نمبر آیا۔ سب سے منہ ہو گئے تھے۔ گویا اپنے ہی مکان میں ہوں کرسیاں اُلٹ گئیں۔ دیواروں پر کی تصویریں ٹوٹ گئیں۔ ایک نے میز اُلٹ دی۔ دوسرے نے کابیوں کا گیند بنا کر اُچھالنا شروع کیا۔

یہاں یہی ہنگامہ برپا تھا کہ شہر کے رئیس لالہ اجاگر مل تشریف لائے اُنہوں نے یہ تماشا دیکھا تو گھبرائے۔ خانساماں سے پوچھا کہ یہ کیا گول مال ہے شیخ جی۔ صاحب دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔

نور علی۔ صاحب کا حکم ہی ایسا ہے تو کیا کرے؟ آج اُنہوں نے اپنے ملازموں کی دعوت کی ہے۔ اُن سے ہولی کھیلنے کو بھی کہا ہے۔ سُنتے ہیں لاٹ صاحب کے یہاں سے حکم آیا ہے کہ رعایا کے ساتھ خوب ربط ضبط رکھو اور ان کے تیوہاروں میں شریک ہو۔ جبھی تو یہ حکم دیا ہے ورنہ ان کے تو مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ آپ تشریف رکھئے۔ نکالوں کوئی مزیدار چیز ابھی حال میں ولائت سے پارسل آیا ہے۔

رائے اجاگر مل بڑے آزاد خیال تھے۔ انگریزی دعوتوں میں بے دھڑک شریک ہوتے

تھے۔ طرزِ معاشرت بھی انگریزی تھا۔ اور یونین کلب کے تو وہ کرتا دھرتا تھے۔ انگریزوں سے ان کی خوب چھنتی تھی۔ اور مسٹر کراس تو اُن کے گہرے دوست تھے۔ حاکم ضلع سے خواہ وُہ کوئی ہو۔ ہمیشہ ان کا گہرا تعلق رہتا تھا۔ نور علی کی باتیں سُنتے ہی ایک کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ اچھا یہ بات ہے۔ ہاں تو پھر نکالو۔ کوئی مزیدار چیز۔ کچھ مزے کی چیز ہو۔

نور علی۔ حضور آپ کے سامنے سب کچھ حاضر ہے۔

لالہ صاحب کچھ تو گھر سے پی کر چلے تھے۔ یہاں کئی گلاس چڑھائے تو لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولے۔ کیوں نور علی آج صاحب ہولی کھیلیں گے!

نور علی۔ جی ہاں۔

اودھا گر مل۔ لیکن میں رنگ ڈھنگ تو کچھ لایا نہیں۔ بھیجو جھٹ پٹ کسی کو میرے مکان سے رنگ پچکاری لائے (سائیس سے) کیوں گھسیٹے آج تو بڑی بہار ہے۔

گھسیٹے۔ بہار ہے۔ بڑی بہار ہے۔ ہولی ہے۔

اودھا گر مل (دکھاتے ہوئے) آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔ خوب پچکاری چلاؤں گا۔

گھسیٹے۔ خوب عبیر لگاؤں گا۔

گنوالا۔ خوب گلال اُڑاؤں گا۔

اردلی۔ خوب کبیر سناؤں گا۔

اودھا گر مل۔ آج صاحب کے ساتھ میری ہولی مچے گی۔

نور علی۔ اچھا سب لوگ سنبھل جاؤ۔ صاحب کا موٹر آ رہا ہے۔ بیٹھ جی یہ لیجئے۔ میں دوڑ کر رنگ پچکاری لایا۔ بس ایک چوتالہ چھوڑ دیجئے اور جونہی صاحب کمرے میں آویں اُن پر پچکاری چھوڑ دیجئے اور (دوسرے سے) تم لوگ اُن کے مُنہ میں گلال ملو۔ صاحب خوشی کے مارے پھول جائیں گے۔ وُہ موٹر احاطہ میں آ گیا۔ ہوشیار۔

(۲)

مسٹر گلاس اپنی بندوق لئے ہوئے موٹر سے اُترے اور لگے آدمیوں کو بلانے
مگر وہاں تو زوروں سے چرتالا ہو رہا تھا۔ سنتا کون ہے؟ چکرائے کہ یہ معاملہ کیا ہے کیا سب
میرے بنگلے میں گا رہے ہیں۔ غصہ سے بھرے ہوئے کمرے میں تشریف لائے تو ڈرائنگ روم (کھانے
کا کمرہ) سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اب کیا تھا۔ جامے سے باہر ہو گئے۔ چہرہ تمتما گیا۔ ہنٹر
لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔ لیکن ابھی ایک قدم دروازہ کے باہر ہی تھا کہ سیٹھ
اوجاگرمل نے پچکاری چلائی۔ سارے کپڑے تر بتر ہو گئے۔ آنکھوں میں بھی رنگ چلا گیا آنکھیں
پونچھ ہی رہے تھے کہ سائیس گوالا سب کے سب دوڑے اور صاحب کو پکڑ کر ان کے منہ پر
رنگ ملنے لگے۔ دھوبی نے تیل اور کاجل کا مرکب لگا دیا۔ صاحب کے غصہ کی حد نہ رہی ہنٹر
لے کر سبھوں کو اندھا دھند مارنے لگے۔ بیچارے سوچے ہوئے تھے کہ صاحب خوش ہو کر
انعام دیں گے۔ ہنٹر پڑے تو نشہ کافور ہو گیا۔ کوئی اِدھر بھاگا کوئی اُدھر۔

سیٹھ اوجاگرمل نے یہ رنگ دیکھا تو تاڑ گئے کہ نوکروں نے چکمہ دیا۔ ایک گوشہ میں دبک
رہے۔ جب کمرہ نوکروں سے خالی ہو گیا تو صاحب ان کی طرف بڑھے۔ لالہ صاحب کے ہوش
اُڑ گئے۔ تیزی سے کمرہ کے باہر نکلے اور سر پر پیر رکھ کر بے تحاشا بھاگے۔ صاحب ان کے
پیچھے دوڑے۔ سیٹھ جی کی فٹن پھاٹک پر کھڑی ہوئی تھی۔ گھوڑے نے دھم دھم لٹ
پٹ کی آواز سنی تو بھڑکا۔ کنوتیاں کھڑی کیں اور فٹن کو لے کر بھاگا۔ عجیب منظر تھا آگے
آگے فٹن اس کے پیچھے سیٹھ اوجاگرمل۔ ان کے پیچھے ہنٹر لئے ہوئے مسٹر گلاس۔ سب بگٹٹ دوڑے
چلے جاتے تھے۔ سیٹھ جی ایک بار ٹھوکر کھا کر گرے مگر صاحب کے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئے
احاطے کے باہر سڑک تک گھوڑ دوڑ رہی۔ بالآخر صاحب رک گئے۔ منہ میں کالک لگائے اب دور
آگے جانا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ یہ خیال بھی ہوا کہ سیٹھ جی کو کافی سزا مل چکی اپنے نوکروں کی
خبر لینا ضروری تھی۔ واپس گئے سیٹھ اوجاگرمل کی جان میں جان آئی بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ گھوڑا
بھی ٹھٹھک گیا۔ کوچوان نے اُتر کر اسے سنبھالا۔ اور گودی میں اٹھا کر گاڑی میں

بہلا دیا۔

لالہ دیاگرمل شہر کی موالاتی جماعت کے پیشوا تھے۔ انہیں انگریزوں کی نیک نیتی پر پورا پورا اعتقاد تھا۔ انگریزی سلطنت کی تعلیمی، مالی، اور ملکی ترقی کا راگ الاپا کرتے تھے۔ اپنی تقریروں میں تارکان موالات کو خوب پھٹکارا کرتے تھے۔ انگریزوں میں ادھر قدر و منزلت خاص طور پر ہونے لگی تھی۔ کئی بڑے بڑے ٹھیکے جو پہلے انگریز ٹھیکیداروں ہی کو ملا کرتے تھے ان کو دیدیئے گئے تھے۔ ترک موالات کی تحریک نے ان کی عزت و دولت میں خوب اضافہ کیا تھا۔ بس وہ زبان سے تحریک مذکورہ کی خواہ کتنی مذمت کریں مگر دل سے اس کی ترقی چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا۔ کہ یہ تحریک ایک ہوا ہے۔ جب تک بہتی رہے اس میں اپنے بھیگے کپڑے سکھا لیں۔ وہ تارکان موالات کے کاموں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اور حکام کو ان مصنوعی باتوں پر یقین کرتے دیکھ کر دل میں ان پر خوب ہنستے تھے۔ جوں جوں عزت بڑھتی تھی۔ ان کی خودداری میں بھی افزونی ہوتی جاتی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح بزدل نہ تھے۔ گاڑی پر بیٹھے اور ذرا سانس ٹھکانے ہوئی۔ تو اس واقعہ پر غور کرنے لگے۔ ضرور نور علی نے مجھے دھوکا دیا۔ اسکی تارکان موالات سے سانٹھ گانٹھ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مانا کہ میرا پچکاری چلانا صاحب کو برا معلوم ہوا۔ اور یہ لوگ ہولی نہیں کھیلتے تو بھی ان کا غصہ سے اسقدر دیوانہ ہوجانا اسکے سوا اور کیا ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ہمیں کتوں سے بہتر نہیں سمجھتے۔ ان کو اپنے اقتدار پر کتنا غرہ ہے۔ یہ میرے پیچھے ہنٹر لے کر دوڑے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ جو میری تھوڑی بہت عزت کرتے تھے وہ صرف ایک دھوکا تھا۔ دل میں ہمیں اب بھی ذلیل اور کمینہ خیال کرتے ہیں۔ شوخ رنگ کوئی تیز نہیں تھا ہم بڑے دن میں گرجے جاتے ہیں۔ انہیں ڈالیاں دیتے ہیں۔ وہ ہمارا تہوار نہیں ہے مگر یہ ذرا سا رنگ ڈال دینے پر اتنا بگڑ اٹھا۔ اور یہ بے عزتی۔ مجھے اس کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہوجانا چاہئے تھا۔ بھاگنا بزدلی تھی۔ اسی سے یہ شیر ہوجاتے ہیں کوئی خک

نہیں کہ یہ سب مل کر اسہیوگیوں کو زیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ منکسر مزاجی اور شرافت صرف مجھ کو سیدھا کرنے کے لئے ہے۔ ان کی خود مختاری ان کا غرہ رہی ہے۔ ذرا بھی فرق نہیں سیٹھ جی کے دلی خیالات نے سنگین صورت اختیار کی۔ میری یہ ذلت۔ اپنی بے عزتی کی یاد ان کے دل کو روز روز کر بے قرار کر رہی تھی۔ یہ میرے موالاتی ہونے کا نتیجہ ہے۔ میں اسی قابل ہوں۔ میں ان کی بہیمانہ باتیں سن سن کر پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے کوتاہ فہمی سے اتنا بھی نہ سوجھتا تھا کہ آزاد اور غلام میں کوئی میل جول نہیں ہو سکتا۔ میں اسہیوگیوں کی بے تعلقی پر ہنستا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ ہنسنے کے قابل نہیں۔ بلکہ میں خود ہی قابل مذمت ہوں۔

وہ اپنے گھر جا کر سیدھے کانگرس کمیٹی کے دفتر کی طرف گئے۔ وہاں ایک بڑی مجلس تھی۔ کمیٹی نے شہر کے اچھوت اور ہر چھوٹے بڑے کو ہولی کا جشن منانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ ہندو مسلم ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے محبت سے ہولی کھیل رہے تھے۔ پھل وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس وقت لیکچر ہو رہا تھا۔ سیٹھ جی گاڑی سے تو اترے مگر جلسہ میں جاتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ جھجکتے ہوئے آہستہ سے جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر لوگ چونک پڑے۔ یہ خوشامدیوں کے سرغنہ آج یہاں کیسے بھول پڑے۔ انہیں تو موالاتی جلسہ میں بادشاہ کی تجویز پاس کرنا چاہئے تھی۔ شاید مخبر بن کر آئے ہیں۔ کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں۔ انہیں چڑانے کے لئے لوگوں نے کہا۔ کانگرس کی جے۔

اوچاگرپل نے بلند لہجہ میں کہا۔ اسہیوگ کی جے۔

پھر آواز آئی۔ خوشامدیوں کی چھے۔

سیٹھ جی نے بلند آواز سے کہا۔ جی حضوریوں کی چھے۔

یہ کہہ کر وہ کل حاضرین جلسہ کو حیرت میں ڈالتے ہوئے پلیٹ فارم پر جا پہنچے اور ندامت آمیز لہجہ میں بولے۔

بھائیو۔ دوستو! میں نے اب تک آپ سے ترک تعلق کیا تھا۔ اسے معاف فرمائیے

میں تہ دل سے آپ سے معافی چاہتا ہوں مجھے گھر کا بھیدی جاسوس یا بھبھیکن نہ سمجھئے۔ آج میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا ہے۔ آج اس پاک اور محبت انگیز ہولی کے دن میں آپ سے ملاپ کرنے آیا ہوں۔ اپنی فراغدلی سے کام لیجئے آپ سے دشمنی کرنے کی آج مجھے سزا مل گئی۔ حاکم ضلع نے آج میری بڑی بے عزتی کی۔ میں وہاں سے ہنٹروں کی مار کھا کر آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میں ملک کا دشمن تھا۔ قوم کا دشمن تھا۔ میں نے اپنی خود غرضی سے جھوٹے اعتبار میں آ کر ملک کا بڑا نقصان کیا۔ اس کے لیے خوب کمانے ہوئے۔ اسکی یاد آتے ہی جی چاہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے کر ڈالوں (ایک آواز) ہاں ضرور کر ڈالیے۔ آپ سے نہ ہو سکے تو میں کر ڈالوں (پریذیڈنٹ کی آواز) یہ سخت باتوں کا موقعہ نہیں ہے۔) نہیں آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہ کام اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ مگر ابھی مجھے بہت کچھ کفارہ کرنا ہے۔ نہ جانے کتنے پاپوں کا پرائشچت کرنا ہے۔ امید کہ زندگی کے بقیہ دن یہی پرائشچت کرنے میں یہی منہ کی کالک دھونے میں بسر کروں۔ آپ سے صرف اتنی ہی التجا ہے کہ مجھے اصلاح کا موقعہ دیجئے۔ مجھ پر اعتبار کیجئے اور مجھے اپنا غریب خادم سمجھئے۔ میں آج سے اپنا تن من دھن سب آپ پر قربان کرتا ہوں۔

دعوت

پنڈت موٹے رام شاستری نے گھر کے اندر جاکر اپنے توند پر ہاتھ پھیرا اور گرج کر کہا ۔

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام   داس ملوکا کہہ گئے کہ سب کے داتا رام

سونا نے مسکرا کر کہا کہ کوئی میٹھی تازی خبر ہے کیا ؟

شاستری جی نے پینترا بدل کر کہا۔ مار لیا آج - ایسا تاک کر مارا کہ چاروں شانے چت - سارے گھر کا نیوتہ ہمارے گھر کا وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماروں گا کر دیکھنے والے دنگ رہ جائیں گے ۔

سونا نے کہا۔ کہیں پہلے کی طرح اب بھی دھوکا نہ ہو۔ پکا پوڑھا کر لیا ہے نا ؟

موٹے رام نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ایسا اشگون منہ سے نہ نکالو بڑے جپ تپ کے بعد یہ شبھ دن آیا ہے ۔ جو تیاریاں کرنی ہوں کرلو ۔

سونا۔ وہ تو کروں گی ہی۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتی - جنم بھر گھاس تھوڑا ہی کھودتی رہی ہوں ۔ مگر دعوت سارے گھر کی ہے نا ۔

موٹے رام ۔ اب اور کیسے کہوں ۔ پورے گھر بھر کا نیوتہ ہے ۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہ آیا ہو۔ تو مجھ سے پوچھو۔ عالموں کی بات سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں اگر ان کی بات سب ہی سمجھ لیں تو پھر عالم ہی کیا ۔ بات یہ ہے کہ مرادپور کی رانی صاحبہ سات برہمنوں کو بھوجن کرانا چاہتی ہیں ۔ کون کون مہاشے میرے ساتھ جائیں گے یہ طے کرنا میرا کام ہے جب انگورام شاستری - بینی رام شاستری - چھیدی رام شاستری - بھوانی رام شاستری - پھینکو رام شاستری اور پنڈت موٹے رام شاستری

اتنے آدمی اپنے گھر ہی میں ہیں تو باہر برہمنوں کو ڈھونڈنے کون جائے۔

سونا۔ پر تو کل چھ ہوئے۔ ساتواں آدمی کون ہے؟

موٹے رام۔ ذرا اپنی عقل دوڑاؤ۔

سونا۔ ایک پتل گھر لیتے آنا۔

موٹے رام۔ پھر وہی بات کہی جس میں بدنامی ہو۔ چھی چھی پتل گھر لاؤں کھانا گھر لاکر کھلانے میں وہ مزا کہاں جو ججمان کے گھر بیٹھ کر بھوجن کرنے میں ہے۔ سنو ساتویں مہاشے ہیں پنڈت سونا رام شاستری۔

سونا۔ چلو دل لگی کرتے ہو۔ بھلا میں کہاں جاؤں گی۔

موٹے رام۔ ایسے ہی مشکل موقعوں پر تو علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ قابل آدمی حالات کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور بیوقوف قسمت کا نام لے کر روتے ہیں۔ سونا دیوی اور سونا رام میں کیا فرق ہے۔ صرف ایک پوشاک کا۔ اس ساڑھی کو میری طرح باندھ لو۔ میری مرزائی پہن کر چادر اوپر سے اوڑھ لو۔ پگڑی باندھ دونگا۔ پھر سونا دیوی سے پنڈت سونا رام بننے میں کیا کسر باقی رہ گئی۔

سونا نے ہنس کر کہا۔ مجھے تو شرم آئے گی۔

موٹے رام۔ تمہیں کرنا ہی کیا ہے صرف بیٹھی کھاتی رہنا۔ بات چیت تو ہم کرینگے۔

سونا نے اپنے دل ہی دل میں مٹھائیوں کا خیال کر کے کہا۔ بڑا مزا آئے گا۔

موٹے رام۔ بس اب دیر کرنے کا کام نہیں۔ تیاریاں شروع کردو۔

سونا۔ کتنی بھنگی بنالوں۔

موٹے رام۔ میں نہیں جانتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ رنگ خوب جمے۔

سونا۔ ہاں ایک بات پوچھنا بھول ہی گئی اپنے پاؤں کے بچھوؤں کو کیا کروں؟

موٹے رام نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ انہیں اُتار کر رکھ دینا اور کیا کرو گی۔

سونا۔ نہیں چاہے جو کچھ ہو۔ میں اپنے بچھوے نہ اُتاروں گی۔

موٹے رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ اچھا بیٹے چلو۔ گوبردھن دھاری یہ بیڑا ابھی پار لگا دیں گے۔ بس پاؤں میں بہت سے کپڑے لپیٹ لینا۔ میں کہہ دوں گا کہ ان پنڈت جی کو پیل پاؤں کا روگ ہے کیوں کیسی سوجھی؟

سونا نے پُر تحسین نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ جسم بھر پڑھا نہیں ہے۔

(۲)

شام کے وقت پنڈت جی نے اپنے پانچوں بیٹوں کو بلایا اور سمجھانے لگے۔ لڑکو کوئی کام کرنے سے پہلے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ کیسے کیا ہوگا۔ اگر رانی صاحبہ تم لوگوں سے پتہ نشان دریافت کریں تو میرا نام ہرگز مت لینا۔ سوچو کتنی شرم و بدنامی کی بات ہے کہ مجھ جیسا ودوان بھوجن کے لئے اتنا بڑا ڈھونگ رچے۔ تم سب ذرا دیر کے لئے بھول جانا کہ میرے بیٹے ہو۔ سنسار میں ناموں کی کمی نہیں کوئی اچھا سا نام چُن کر بتا دینا پتا کا نام بدل دینے سے کوئی گالی نہیں چڑھتی۔

الگو رام۔ آپ ہی کوئی نام بتا دیجئے۔

موٹے رام۔ اچھی بات سنو۔ الگو رام کے پتا کا نام ہے پنڈت کیشو پانڈے۔ خوب یاد کر لو۔ بینی رام پنڈت منگر داد جھا کا بیٹا ہے۔ دیکھو یاد رکھنا۔ چھیدی رام تیرے باپ کا نام دھرنی تیواری۔ دیکھو بھولنا نہیں بھوانی! تو اپنے باپ کا نام گنگو پانڈے بتلانا دیکھ اگر بھولا تو خیر نہیں۔ بیٹا پھینکو رام تم یاد کر لو۔ منشو رام پاٹھک۔ بس اب ٹھیک ہے۔ اچھا میں دوبارہ پوچھتا ہوں۔ الگو تیرے پتا کا نام کیا ہے؟

الگو رام۔ پنڈت کیشو پانڈے

موٹے رام۔ ٹھیک ہے اچھا بینی رام تو بتلا!

بلیبی رام - دمڑی تیواری۔

چھیدی رام - واہ یہ تو میرے باپ کا نام ہے۔

موٹے رام - افسوس پنڈت کا لڑکا ہو کر تو ایک نام بھی یاد نہیں رکھ سکتا تیرے باپ کا نام ہے - منگر داد جھا۔ کہہ پچاس مرتبہ منگر داد جھا۔ منگر داد جھا۔

پنڈت موٹے رام شاستری اپنے بیٹوں کا اسی طرح امتحان لے رہے تھے کہ ان کے پیارے دوست چنتا منی جی نے دروازے پر آواز دی۔

پنڈت موٹے رام ایسے گھبرائے کہ سر پیر کی خبر نہ رہی۔ لڑکوں کو بھگاتا ہی چاہتے تھے کہ پنڈت چنتا منی گھر کے اندر آگئے۔ دونوں پنڈتوں میں بچپن سے گاڑھی دوستی تھی دونوں ہمیشہ ایک ساتھ بھوجن کے لیے جایا کرتے تھے لیکن آج موٹے رام چنتا منی کو ساتھ نہ لے جانا چاہتے تھے۔ اگر ان کو ساتھ لے جائیں تو گھر کے ایک آدمی کو چھوڑنا پڑے۔ اس زبردست ایثار کے لیے پنڈت موٹے رام تیار نہ تھے۔

پنڈت چنتا منی نے جو یہ مجمع دیکھا تو کچھ بھانپ کر بولے بھائی اکیلے اکیلے معلوم ہوتا ہے کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔

موٹے رام نے منہ لٹکا کر جواب دیا دوست کیسی باتیں کرتے ہو ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ مجھے موقع ملا ہے اور میں تم کو اپنے ساتھ نہ لے گیا ہوں معلوم نہیں کہ زمانہ بدل گیا یا کچھ گرہ کا پھیر ہے کہ آج کل تو کوئی جھوٹوں بھی بات نہیں پوچھتا۔

چنتا منی - اچھا تو یہاں لڑکے کیوں جمع ہیں۔

موٹے رام - میں لڑکوں کو پڑھا رہا تھا۔

چنتا منی کو اب بھی یقین نہ آیا۔ پنڈت موٹے رام کے سب سے چھوٹے بیٹے پھیکو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ بیٹا کیا پڑھ رہے ہو۔

موٹے رام نے اس خوف سے کہ کہیں بچہ سارا بھانڈا نہ پھوڑ دے چنتا منی سے کہا

اجی یہ کچھ نہیں پڑھتا۔ دن بھر کھیلا کرتا ہے۔

بھیکو رام کے لیئے یہ الزام ناقابل برداشت تھا اس نے رو کر کہا پتا جی یونہی کہا کرتے ہیں کہ یہ پڑھتا نہیں۔ دن بھر کھیلا کرتا ہے۔ ہم کو تو یاد ہے پنڈت سیتو رام پاٹھک

موٹے رام نے گھور کر بھیکو رام کی طرف دیکھا اور کہا جا باہر کھیل

بھیکو۔ آپ مجھے کیوں ڈانٹتے ہیں میں تو جانتا ہوں پنڈت سیتو رام پاٹھک۔

پنڈت موٹے رام مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگے۔ بھیکو کو مارنے کے لیئے اٹھے مگر چنتا منی نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا یار آخر کیا معاملہ ہے؟

موٹے رام۔ کچھ نہیں۔ تم کو تو یونہی شک ہوتا ہے۔

پنڈت چنتا منی کے شبہ کو اور زیادہ تقویت ہوئی مگر باوجود غور کرنے کے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ سیتو رام پاٹھک کے کیا معنی ہیں۔

چنتا منی پنڈت موٹے رام کے مکان سے رخصت ہو کر نکلے۔ پر اس امید سے کہ شاید کچھ پتہ مل جائے اپنے مکان نہ گئے باہر سڑک پر ٹہلتے رہے اتنے میں بھیکو رام گھر سے باہر نکلا۔ چنتا منی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے پوچھا۔ کہاں نیوتہ ہے بیٹا! اتفاق سے تبھی اس بات کی بھنک پنڈت موٹے رام کے کانوں تک پہنچ گئی گھبرا کر باہر نکلے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی پنڈت چنتا منی بھیکو کو گود اٹھا کر بھاگے۔ پنڈت موٹے رام سمجھ گئے کہ اب بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ کہتے ہوئے پنڈت چنتا منی کے پیچھے دوڑے۔ ارے لڑکے کو کہیں لیئے جاتے ہو۔ دُشٹ کہیں کا۔ چنتا منی کہے دیتا ہوں کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا پھر کبھی کسی نیوتے میں نہ لے جاؤں گا بھلا چاہتے ہو تو بھیکو کو گود سے اتار دو۔ مگر پنڈت چنتا منی نے ایک نہ سنی بھاگتے ہی چلے گئے پنڈت موٹے رام اسم با مسمیٰ تھے ان کیلئے ایک قدم دوڑنا بھی مشکل تھا۔ مگر اس وقت ہمت سے کام لے کر بھینسے کی طرح ہانپتے اور کلمات نازیبا بکتے ہوئے چنتا منی کے پیچھے دلکی چال سے چلے جا رہے تھے۔ اتفاق سے

پنڈت موٹے رام کی دھوتی ڈھیلی ہو گئی اور وہ اُلجھ کر گر پڑے چنتامنی نے پیچھے مڑ کر یہ حالت دیکھی تو رک گئے اور پھینکو رام سے پوچھا کیوں بیٹا کہاں نیوتہ ہے بتا دو ہم مٹھائی دیں گے

پھینکو رام۔ رانی کے یہاں۔

چنتامنی۔ کہاں کی رانی۔

پھینکو رام۔ یہ میں نہیں جانتا۔ بس رانی ہیں۔

شہر میں کئی رانیاں تھیں۔ پنڈت جی نے سوچا کہ سب رانیوں کے محلوں کا چکر لگاؤں گا جہاں بھوج ہوگا وہاں ضرور بھیڑ بھاڑ ہوگی۔ بس پتہ چل جائے گا۔ یہ خیال کر کے وہ لوٹ پڑے اور پھینکو کو گود میں لے پنڈت موٹے رام کے پاس آئے دیکھا تو وہ لیٹے ہوئے کراہ رہے ہیں گھبرا کر پوچھا۔ دوست گر کیسے پڑے ہو۔ یہاں کہیں گڑھا بھی تو نہیں ہے۔

موٹے رام۔ تمہیں اس سے کیا مطلب لڑکے کو لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھو۔

چنتامنی۔ میں یہ کپٹ بیوہار نہیں کرتا۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم برا مان گئے اٹھ بیٹھو یار رام کا نام لے کر میں سچ کہتا ہوں میں نے کچھ نہیں پوچھا۔

موٹے رام۔ جھوٹ بولتے ہو۔

چنتامنی۔ جنیؤ ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں۔

موٹے رام۔ تم گنگا میں ڈوب کر قسم کھاؤ جب بھی مجھے بشواس نہ آئے۔

چنتامنی۔ دوسرا یہ بات کہتا تو مونچھ اکھاڑ لیتا۔

موٹے رام۔ تو پھر آ جاؤ۔

چنتامنی۔ پہلے پنڈتائن سے پوچھ لو۔ ابھی تم کو دس برس تک پڑھانے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ پنڈت موٹے رام یہ طعنہ برداشت نہ کر سکے فوراً اٹھ بیٹھے اور پنڈت چنتامنی سے علمی بحث شروع کر دی۔ دونوں مہاشے اس زور کے ساتھ گرج گرج ہنومان کے اشلوک پڑھ رہے تھے جیسے دو بھینسے آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔

موٹے رام - جیا یا بکرم بجرنگی۔

چنتامنی - بھوت پشاچ نکٹ نہ آوے

موٹے رام - جےجےجے ہنومان گوسائیں۔

چنتامنی - پربھو رکھیے لاج ہماری۔

موٹے رام (بگڑ کر) یہ ہنومان چالیسہ میں نہیں ہے۔

چنتامنی - یہ ہم نے رچا ہے کیا تمہاری طرح رٹنت ودیا ہے جتنا ہو اتنا رٹ دیں۔

موٹے رام - اب ہم رچنے پر آ جائیں تو ایک دن میں ایک لاکھ ودیا رچ ڈالیں۔

دونوں مہاتما اپنی اپنی سخن گوئی کی ڈینگیں مار رہے تھے کہ اتنے میں کسی شخص نے چنتامنی کے گھر جا کر کہہ دیا پنڈت موٹے رام اور پنڈت چنتامنی میں بڑی لڑائی ہو رہی ہے پنڈت چنتامنی کی تین بیویاں تھیں۔ ان تینوں کا رعب سارے محلہ پر چھایا ہوا تھا۔ پنڈت جی نے اپنی بیویوں کے نام تو بہت شیریں رکھے تھے۔ یعنی بڑی بیوی کو امرتی "منجھلی کو گلاب جامن" اور چھوٹی کو موہن بھوگ" کہتے تھے۔ لیکن ان عورتوں کا مزاج اسقدر ترش تھا کہ توبہ بھلی۔ محلہ کے سب آدمی ان سے ڈرتے تھے۔ لڑائی کی خبر پاتے ہی تینوں بیویاں پنڈت موٹے رام کے مکان کی طرف روانہ ہوئیں۔ چھوٹی بیوی پہلی دو عورتوں کے مقابلہ میں کسی قدر دبلی تھی وہ لپک کر جلدی پہنچ گئی۔ اسکی صورت دیکھتے ہی پنڈت موٹے رام کے حواس باختہ ہو گئے۔ سمجھ گئے اب خیریت نہیں ہے گھبرا کر گھر کی طرف بھاگے۔ چنتامنی نے للکار کر کہا۔ اجی بھاگے کیوں۔ کچھ مجا تو چکھتے جاؤ۔

موٹے رام نے بھاگتے ہوئے جواب دیا۔ میں ہار گیا بھائی ہار گیا۔

(۲)

رات کے آٹھ بجے پنڈت موٹے رام نے پوجا پاٹ اور اشنان سے فارغ ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔ اب بہت دیر نہ کرنا چاہیے۔ بھنگ تیار ہے نا۔

سونا - پھنکی لئے تو کب سے بیٹھی ہوں - تمہیں کسی بات کی بھی شعور نہیں رہتی - رات میں کون دیکھتا ہے کہ کتنی دیر پوجا کرتے ہو -

موٹے رام - تم سمجھتی نہیں بھوجن سے پہلے ہمیشہ دیر میں جانا چاہئے تا کہ ججمان یہ سمجھے کہ پنڈت جی کو یاد نہیں رہا بھول گئے - لاؤ تھوڑی سی پھنکی لڑکوں کو بھی کھلا دیں -

سونا - انہیں میں نے صبح ہی کھلا دی تھی -

موٹے رام - کوئی سویا تو نہیں -

سونا - آج بھلا کون سوئے گا - سب بھوک بھوک چلا رہے ہیں - میں نے ابھی ایک پیسے کے چنے منگوا دیئے - سب کے سب اوپر بیٹھے کھا رہے ہیں (دیکھو آپس میں مار پیٹ بھی ہو رہی ہے)

موٹے رام - جی چاہتا ہے تمہاری گردن پکڑ کر اینٹھ دوں - بھلا چنے منگوانے کی کیا ضرورت تھی - جب یہیں کھائیں گے تو ججمان کے یہاں تمہارا سر کھائیں گے -

سونا - میں کیا کرتی سب دل کر رو رہے تھے -

موٹے رام - رونے دیتے رونے دیتی - رونے سے ان کا پیٹ نہ بھرتا - بلکہ اور بھوک کھل جاتی -

اتنے میں رانی کے ملازم نے دروازے پر آواز دی - پنڈت جی مہارانی بلا رہی ہیں اور لوگوں کو بھی ساتھ لے کر جلدی چلو -

پنڈت جی نے پُر غرور نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا - دعوت اسے کہتے ہیں - اس کے بعد باہر نکل کر رانی کے ملازم سے کہا - تم اگر ذرا دیر کو اور نہ آتے تو میں کتھا سنانے چلا گیا ہوتا - مجھے تو بالکل یاد ہی نہیں تھا - تم چلو میں ابھی آتا ہوں -

(۴)

نو بجے کے بعد پنڈت موٹے رام مردانہ لباس میں اپنی بیوی اور بچوں کو لیکر رانی کے

یہاں پہنچے۔ رانی صاحبہ نے پنڈت جی کو اندر بلا کر ان کے چرن چھوئے اور پھر مسکرا کر پوچھا آپ ان بچوں کو کہاں سے پکڑ لائے؟

موٹے رام۔ کرتا کیا سارا نگر چھان مارا۔ لیکن کسی برہمن نے آنا منظور نہ کیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے ان پنڈتوں کے لڑکوں کو لے آیا۔ کیوں پھینکو رام کہا ہے پتا جی کا کیا نام ہے۔

پھینکو رام۔ پنڈت بیتو رام پھاٹک۔

رانی۔ یہ بچہ بہت تیز اور ہونہار معلوم دیتا ہے۔

جب لڑکوں نے دیکھا کہ رانی صاحبہ پھینکو رام کی تعریف کر رہی ہیں تو انھوں نے بھی بغیر پوچھے ہوئے اپنے اپنے باپوں کے نام سنانا شروع کر دیئے۔

جب سامنے پتل رکھ دیئے گئے اور مہراجن چاندی کی تھالی میں سامان لا کر ایک ایک کے سامنے رکھنے لگا تو موٹے رام کو پنڈت چنتامنی کی یاد آئی اگر وہ اس وقت ہوتے تو خوب رنگ جمتا۔ اب کھانے میں ڈانٹ ڈپٹ کیسے ہوگی کیونکہ جب تک کوئی مقابلہ پر نہ ہو۔ اس وقت تک کھانے نہیں بنتا۔ سونا دیوی پر یہ خیال ظاہر کیا۔ سونا نے کہا کہتیں آج کیا ہو گیا ہے۔ اس کو کیوں بلانا چاہتے ہو؟

موٹے رام۔ کوئی ساتھ دینے والا بھی تو چاہیئے۔

سونا۔ کیا میں تم سے کھانے میں دب جاؤں گی؟

موٹے رام۔ تم جانتی نہیں گھر کی بات اور ہے دنگل کی بات اور۔ اگر چنتامنی اس وقت آگیا تو جھنڈے گاڑ دوں گا۔

یہ کہہ کر پنڈت موٹے رام نے رانی سے کہا۔ میرے ایک خاص دوست اور بہت بڑے ودوان پنڈت چنتامنی جی ہیں۔ اجازت ہو تو ان کو بلا لوں۔ میں ان سے دعوت کے واسطے کہنا بھول گیا۔ ابھی یاد آئی۔

رانی - آپ کی مرضی ہو تو بلا لیجیے۔

موٹے رام - ہاں سرکار ابھی دوڑتا ہوا جاتا ہوں۔

رانی - آپ میری موٹر لے جائیں۔

موٹر تیار ہوئی اور موٹے رام چنتامنی کے گھر روانہ ہوئے۔ پنڈت چنتامنی اپنے صحن میں غمگین بیٹھے ہوئے تھے آج ان کے سب سے بڑے دوست موٹے رام نے ان کے ساتھ بیوفائی کی۔ طرح طرح کے کھانوں کا خیال کر کے ان کی رال ٹپکی پڑتی تھی بار بار اپنی بیوی سے کہتے۔ اوہو کیا رسیلی امرتیاں ہونگی۔ اب میوے سے بھرے لڈو آئے ہونگے۔ ہائے موٹے رام اکیلے اکیلے ہی ان کا مزہ لیگا۔ اتنے میں موٹے رام نے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ چنتامنی کی بڑی بیوی امرتی دیوی نے بگڑ کر کہا۔ کون داڑھی جار اتنی رات کو جگا رہا ہے۔

موٹے رام - گالی مت دو۔ ارے ہم ہیں ہم۔

امرتی دیوی - ہے تیرے منہ میں جھلسا لگاؤں نگوڑے کہتا ہے ہم ہیں۔ ہم کو جانے تیں کون ہے۔

موٹے رام - ارے ہماری آواز نہیں پہچانتی۔ ہم ہیں ہم تمہارے دیور جی۔

امرتی - دور یہاں سے۔ تیری لہاس (لاش) اٹھے۔ ہمارا دیور بنتا ہے۔

موٹے رام - ہم ہیں ہم تمہارے دیور پنڈت موٹے رام شاستری۔

امرتی دیوی نے دروازہ کھولا اور موٹے رام سے کہا۔ ارے تم نے اپنا نام پہلے نہ بتایا۔ جب اتنی گالیاں کھائیں تب بول نکالا۔

موٹے رام - چنتامنی دوست چلو۔ تم کو لینے آیا ہوں رانی صاحبہ کے یہاں دعوت ہے

چنتامنی - جب تو نہ لے گئے۔ اب بھوجن ہو چکا تو زخموں پر نمک چھڑکنے آئے ہیں۔

موٹے رام - نہیں یار ابھی بھوجن نہیں ہوا۔ میں تم کو لینے آیا ہوں۔ جلدی کرو آج

تمہیں بد کر پچھاڑ دوں گا۔

چنتامنی - تم بچارے مجھے کیا پچھاڑو گے سارے شہر میں تو کوئی ایسا مائی کا لال نہیں ہے

موٹے رام - ابھی یہاں بہت محنت کی ہے۔ بھنڈارے کا بھنڈارا صاف کر دیں اور پھر بھی کھانے کی خواہش باقی رہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ ہم کھانے کے بعد آج تک کبھی کھڑے نہ ہو سکے جب گھر آئے گاڑی پر لد کر۔

چنتامنی - یہ کون بڑی بات ہے ہم تو ہمیشہ مُردے کی طرح ٹکٹکی پہ اُٹھا کر لائے جاتے ہیں۔ ایسی ایسی ڈکار لیتے ہیں۔ جیسے بم کا گولہ چھوٹ رہا ہو۔ ایک بار خفیہ پولیس نے اسی شبہ میں ہمارے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔

موٹے رام - جھوٹ بولتے ہو۔ اس طرح کوئی ڈکار نہیں لے سکتا۔

چنتامنی - اچھا تو آکر سن لینا ڈر کر بھاگ نہ جاؤ تو سہی۔

(۵)

موٹر رانی کے محل کے سامنے رکی اور دونوں مہاتما اُترے۔ اب ہر ایک کو یہی فکر تھی کہ پہلے میں رانی صاحبہ کے سامنے جا کر اپنا رنگ جماؤں۔ دونوں قدم بڑھانے لگے چنتامنی ہلکے ہونے کے سبب ذرا آگے بڑھ گئے تو پنڈت موٹے رام دوڑنے لگے چنتامنی بھی دوڑ پڑے آخر میں موٹے رام نے ہانپتے ہوئے کہا یار ٹھہر جاؤ میرے پاؤں میں کانٹا لگ گیا ہے۔

چنتامنی - تو نکال لو۔ جب تک میں چلتا ہوں۔

موٹے رام نے بہت بہانے کئے مگر چنتامنی نے ایک نہ سنی اور رانی صاحبہ کے کمرے کے اندر پہنچ کر دم لیا۔

رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ پنڈت جی نے سامنے پہنچ کر آواز لگائی۔

ہے ہے جیو دے تو بال کشو مرار نا ما!

رانی - کون ہے؟ کیا مطلب ہے؟

چنتامنی ۔ حضور میں ہوں پنڈت چنتامنی، آپ نے مجھے بھوجن کے واسطے بلایا ہے۔
رانی ۔ آپ ہی پنڈت چنتامنی ہیں، اچھا پنڈت موٹے رام شاستری کہاں رہ گئے۔
چنتامنی ۔ سرکار وہ پیچھے آرہے ہیں۔ بھلا میرے برابر چل سکتا ہے وہ تو میرا شاگرد ہے
رانی ۔ اچھا تو وہ آپ کے شاگرد ہیں۔
چنتامنی ۔ حضور میں کس منہ سے کہوں۔ برہمن کو خاکساری چاہیے ورنہ سب
چیلے میرے گورو ہیں۔

اتنے میں پنڈت موٹے رام بھی ہانپتے ہوئے پہنچ گئے رانی صاحبہ دونوں پنڈتوں
کو اپنے ہمراہ لے کر کمرے سے باہر نکلیں۔ بھنڈاری نے سامان نکالنا شروع کیا بھوشا
دیوی اور اس کے نیچے بیٹھے ہوئے بھوک کے بیتاب ہو رہے تھے چنتامنی نے رامائن کی چوپائیوں
کا پاٹ شروع کیا۔ موٹے رام نے بہت کچھ ذہن دوڑایا لیکن بھوک کی شدت میں کوئی
شلوک یا کوئی منتر یاد نہ آیا۔ مجبور ہو کر وہ رام نام رام نام لے رہے من اونچے سروں میں
الاپنے لگے۔ چنتامنی کو بھی اب اپنی آواز بلند کرنی پڑی موٹے رام نے بھی اور زور سے
گرجنا شروع کیا اتنے میں بھوگ کی تیاری ہوئی نوکر چاکر مستعد ہو گئے کسی نے گھنٹہ لیا کسی نے
گھڑیال کسی نے شنکھ کسی نے کرتال پنڈت چنتامنی نے لپک کر آرتی اٹھا لی موٹے رام دل ہی
دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے رانی کے پاس پہنچنے کا موقعہ ان کو نہ ملا۔ آرتی ختم ہو گئی
پنڈت چنتامنی اور رانی صاحبہ کے درمیان کچھ سرگوشیاں ہوئیں بھوجن شروع ہونے ہی کو
تھا کہ رانی صاحبہ کا کتا رسوئی میں گھس گیا پنڈت موٹے رام کے پیر تلے زمین نکل گئی
رانی صاحبہ نے کہا۔ ہائیں یہ کتا کیسے چھوٹ گیا۔ افسوس ساری محنت اکارت ہوئی اب تو
رسوئی بھرشٹ ہو گئی۔

موٹے رام ۔ سرکار کوئی ہرج نہیں ہے۔
سونا ۔ جاگتے جاگتے آدھی رات گذر گئی۔ اب یہ مصیبت پڑے گی۔
موٹے رام ۔ اچھا تو ہم لوگ جاتے ہیں۔

رانی - ہاں تو اور کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سب کو بیکار تکلیف ہوئی اس کُتے نے سارا کام بگاڑ دیا۔ جمعدار سارا سامان بھنگی کو دیدو۔ مگر ہاں یہ دو بچے بہت چھوٹے ہیں۔ یہ کیوں بھوکے رہیں تھوڑا سامان موجود ہے۔ وہ ان کو کھلا دینا چاہیئے۔ جھینکو رام مٹھائی کھاؤ گے؟

جھینکو - اور پھر آئے کس لئے تھے۔

رانی - اچھا سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے ورنہ مٹھائی نہیں ملیگی۔

موٹے رام - اب جانے دیجئے۔ مجھ کو دیر ہوتی ہے۔

چنتامنی - کیا ہرج ہے نام پوچھ لینے دو۔

موٹے رام - تم چپ رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

رانی - آپ اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں۔ نام پوچھنے میں بھی کوئی برائی ہے ہاں ہاں جھینکو رام اپنے باپ کا نام سچ سچ بتاؤ پھر بہت سی مٹھائی کھانے کو دیں گے۔ بتا دو بیٹا بتا دو۔ ورنہ مٹھائی نہیں ملے گی۔

جھینکو رام نے آہستہ سے کوئی نام لیا۔ اس پر پنڈت موٹے رام نے بہت زور سے ڈانٹا۔

آپ بچے کو کیوں ڈانٹتے ہیں۔

موٹے رام - یہی تو زمانے میں آگ لگ گئی ہے کہ برہمنوں کو اپنے دروازہ پر بلا کر ذلیل کیا جاتا ہے

چنتامنی - اس میں کیا بات ذلت کی ہے۔

موٹے رام - بس چپ رہنا ورنہ سارا غصہ تم ہی پر اترے گا۔ ماتا پتا کا تو پتہ نہیں۔ برہمن بن کر بیٹھے ہیں۔

چنتامنی - جو من چاہے کہہ لو۔ میں برہمن نہیں شُدر ہوں۔ مگر تم تو برہمن ہو۔ جو اپنے دھرم کی باتیں بھی نہیں جانتے۔ برہمن کا پہلا فرض غصہ کو روکنا ہے۔

موٹے رام - ابے تو پیٹ کا غلام ہے ۔

چنتامنی - کہہ تو دیا بھائی - تم بڑے میں چھوٹا - تمہارے دو کائیں گنا ہوں اور کچھ ہو گئے

رانی - پنڈت چنتامنی جی ایسا نہ کہئے - آپ بہت بزرگ ہیں - اتنے سخت کلمے سننے پر بھی آپ کو غصہ نہیں آتا ۔

پنڈت موٹے رام یہ کہہ کر "اچھا چنتامنی سمجھوں گا" اپنے بچوں کے ہمراہ بھوکے پیاسے مکان کو واپس ہوئے ۔

پنڈت موٹے رام اپنی قسمت کو کوستے ہوئے جا رہے تھے وہاں پنڈت چنتامنی کی پانچوں گھی میں تھیں - آسن مار کے تر مال اُڑا رہے تھے - رانی صاحبہ اپنے ہاتھ سے مٹھائیاں پروس رہی تھیں اتنے میں چنتامنی نے ڈکار لے کر کہا ۔

"سرکار نے دیکھا - کتنا بے شرم آدمی ہے - اپنی عورت کو مردانے کپڑوں میں لے آیا ۔

مگر آج میں نے بھی ایسا سبق دیا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا ۔

چنتامنی نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا - سرکار کی بدھی کو دھنیہ ہے ۔

فکرِ دنیا

جیک یوں دیکھنے میں بہت موٹا تازہ لحیم شحیم تھا۔ بھونکتا تو سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ ڈیل ڈول بھی ایسا تھا کہ اندھیری رات میں اس پر گدھے کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن اسکی دلیری کسی معرکہ میں کبھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ دو چار بار جب بازار کے مرعوب کے شہدوں نے اسے للکارا۔ تو وہ ان کی جسارت کا مزہ چکھانے کے لئے میدان میں آیا اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جب تک لڑا۔ جیوٹ سے لڑا۔ پنجے اور دانتوں سے زیادہ کارہائے نمایاں اسکی دُم نے کئے۔ تحقیقی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ بالآخر میدان کس کے ہاتھ رہا۔ لیکن جب فریقِ مخالف کو اپنی حمایت کے لئے اور کمک منگانی پڑی تو اصولِ حرب کے مطابق فتح کا سہرا جیک ہی کے سر رکھنا زیادہ قرینِ انصاف معلوم ہوتا ہے۔ جیک نے اس وقت مصلحت سے کام لیا اور صلح کر لی۔ لیکن تب سے اس نے ایسے نا اصول بد ذات اور بے راہ رقیبوں کو منہ نہ لگایا۔

اتنا صلح پسند و فروتن اور متحمل مزاج ہونے پر بھی جیک کے رقیبوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے ہمسر تو اس لئے اس سے جلتے کہ یہ اتنا جسیم اور عظیم الجثہ ہو کر بھی اسقدر سلامت روکیوں ہے۔ ان کے خیال میں سلامت روی اسکے شایانِ شان نہ تھی۔ بازاری غول اس سے محض اس لئے بدگمان رہتا تھا کہ جیک کے مارے گھوروں پر کی ہڈیاں اور تیل بھی نہ بچنے پاتے تھے۔ وہ گھڑی رات رہے اٹھتا اور حلوائیوں کی دکانوں کے سامنے کے دونے اور نانبائیوں کی دکانوں کے سامنے کی ہڈیاں ایک ایک کرکے اڑا جاتا وہ اپنے بقائے حیات کی دھن میں بھول جاتا کہ یہ علاقہ دوسروں کا ہے۔

اور میں بِلّا ان کی مرضی کے اس کے اندر قدم رکھنے کا مجاز نہیں ہوں تا وقتیکہ اپنے پنجہ و دنداں سے اپنا استحقاق ثابت کر دوں۔ چنانچہ اتنے دشمنوں کی نگاہوں پر چڑھ کر جیک کی زندگی ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مہینوں گزر جاتے اور سیری نصیب نہ ہوتی۔ کئی بار اسے سیری کی ہوس نے مشکوک ذرائع سے کام لینے پر مجبور کیا مگر جب نتیجہ اُمید کے خلاف ظہور میں آیا اور لقمہ ہائے لطیف اور پُر کے بدلے زیادہ ثقیل اور تحمل آنکا چیزیں شکم پُری کو ملیں تو مجبور ہو کر پھر وہی روش سلامت روی اختیار کی۔

مگر اس نیرنگیٔ تقدیر اور سعی ناموفور نے اشتیاق کو فرو کرنے کے بدلے اور بھی مشتعل کر دیا۔ اس کے دل میں ایک بیتاب کن آرزو پیدا ہوئی۔ کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں شکار بافراط ہو۔ ہرن اور خرگوش اور بھیڑوں کے گلے مرغزاروں میں چرتے ہوں۔ نہ ان کا کوئی مالک ہو۔ نہ محافظ۔ کسی رقیب کا اندیشہ تک نہ ہو۔ آرام کرنے کو گھنے درختوں کا سایہ ہو۔ پینے کو ندی کا صاف ستھرا پانی۔ من مانا شکار کھیلوں کھاؤں اور میٹھی نیند سوؤں چاروں طرف میری دھاک جم جائے۔ ایسا رعب قائم ہو جائے دلوں میں میری ہیبت سما جائے کہ جدھر نکل جاؤں ہلچل پڑ جائے۔ سب جانور مجھی کو اپنا فرمانروا حتیٰ کہ اپنا راجہ سمجھنے لگیں ایسا سکہ بیٹھ جائے کہ کسی رقیب کو ادھر نگاہ اٹھانے کی ہمت تک نہ ہو۔

قضارا ایک دن وہ انہیں دلخوش کُن خیالات کے سرور میں سر جھکائے سڑک چھوڑ کر گلیوں سے چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً ایک جوان ہمت حریف سے اسکی مٹھ بھیڑ ہو گئی جیک نے دبی ہوئی نگاہوں سے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو تھرا گیا چاہتا تھا کہ بچکر نکل جائے مگر حریف روسیاہ اتنا صلح پسند نہ تھا۔ اس نے فوراً جھپٹ کر جیک کی گردن پکڑ لی جیک نے بہت منت و سماجت کی گڑگڑا کر کہا۔ خدارا مجھے چلا جانے دو۔ قسم لے لو۔ جو پھر ادھر قدم رکھوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علاقہ تمہارے ممالک محروسہ میں شامل ہے ورنہ مجھ سے ایسی حماقت ہرگز نہ سرزد ہوتی۔ تم شیر ہو۔ دلیر ہو۔ مرد میدان ہو۔ میں فاقہ کش غریب خستہ حال۔ بھلا تم

سے آنکھیں ملانے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔ پر اس نشۂ خودی کے متوالے شقی اور سیہ باطن وجود کا دل ذرا بھی نہ پسیجا بلکہ اس عجز و الحاح نے اسے اور بھی آمادۂ پرخاش کر دیا۔ خوف کا اندیشہ نہ رہا۔ آخر بدرجۂ مجبوری جیک نے نہایت بیکسانہ انداز سے نالۂ فریاد بلند کیا۔ یہ شور سن کر علاقہ کے چند اور شریر حضرات جمع ہو گئے لیکن وہ بھی جوہر انسانیت سے عاری تھے۔ بجائے اسکے کہ بیکس پر رحم کریں اور بیرحم ظالم کو نشانۂ ملامت و تحقیر بنائیں۔ الٹے جیک ہی پر ٹوٹ پڑے جیک نے راہ فرار اختیار کیا پر ان بہائم نے بہت دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ راستہ میں ایک دریا حائل ہو گیا اور جیک نے توکل بخدا اس میں کود کر اپنی جان بچائی۔ ان ظالموں کو ندی میں کودنے کی ہمت نہ پڑی کہتے ہیں ایک دن کوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں جیک کے دن بھی ندی میں کودتے ہی پھر گئے۔ کودا تھا جان بچانے کے لئے ہاتھ لگ گئے موتی۔ تیرتا ہوا اس پار پہنچا تو وہاں اسکی دیرینہ تمناؤں کی کلیاں کھلی ہوئی تھیں۔

(۱۳)

یہ ایک نہایت وسیع خطہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی۔ سبزہ کا زمردیں فرش بچھا ہوا نظر آتا۔ کہیں مترنم آبشار تھے۔ کہیں شبنم مرغزار۔ ایک دلفریب منظر تھا۔ فرحت و نزہت سے بھانت بھانت کے طیور و چوپائے نظر آئے۔ بعض ایسے درندے کہ جیک انہیں دیکھ کر تھرا اٹھا۔ بعض ایسے خونخوار کہ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایسے ایسے مہیب اژدہے نظر آئے جو ایک کش ہی میں اسے نگل جائیں۔ جیک سخت تشویش میں مبتلا ہوا۔ دلفریب منظر نے جو امیدیں بیدار کر دی تھیں وہ غائب ہو گئیں۔ اس وادیٔ پرخطر میں رات کیونکر بسر ہوگی وہ اسی فکر میں غوطے کھا رہا تھا کہ شام ہو گئی اور تاریکی کے تسلط ہوتے ہی وہاں ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔ درند و پرند قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پنجہ و ناخن منقار و دنداں سے ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے ان کی گرج اور تڑپ۔ چوٹ اور وار دیکھ کر جیک کے ہوش اڑ گئے۔ ایک گوشۂ محفوظ میں دبکا ہوا یہ معرکۂ خونریز دیکھتا رہا۔ ساری رات میدان کارزار گرم رہا۔ خون کی ندی بہتی رہی۔

صبح کو وہاں اس نے جا کر دیکھا تو معرکہ آرائی کا نشان نہ تھا۔ مقتولوں کے انبار لگے تھے کتنے ہی زخم خوردہ سؤر ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ اب کیا تھا جیک کے پو بارہ ہو گئے۔ ایک زخمی سؤر پر ٹوٹ پڑا۔ اور چشم زدن میں اسکی تکا بوٹی کر ڈالی۔ آج مدت دراز کے بعد شاید زندگی میں پہلی بار اسے سیری کا احساس ہوا۔

مگر یہ خونیں نظارے کسی علت یا سبب کے پابند نہ تھے۔ دن اپنے اپنے گوشے میں آرام کرنے کے بعد شام کو اس وادی کے باشندے نکل آتے اور معرکہ کارزار شروع ہو جاتا اور پھر صبح کو جیک لئے لئے اغذیہ لطیف کا دسترخوان بچھا ہوا پاتا۔ یہ روز کا معمول تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عیش بے خلل اور غذاء قوت بخش نے جیک پر جادو کا سا اثر پیدا کیا وہ پہلے سے کہیں زیادہ جسیم دراز قد اور خوفناک ہو گیا اپنے قوائے میں اسے حیرت انگیز توانائی اور چستی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی ہمت بھی کھل گئی وہ اب پیٹ میں منہ دبائے سمٹے کسی گوشہ میں نہ بیٹھتا بلکہ دلیرانہ انداز غرور سے سبزہ زار میں چھلانگیں بھرتا اور کسی چھوٹے موٹے جانور کا شکار بھی کر لیتا۔ ادھر اس خطہ کے دیروں میں روزانہ خونریزی و معرکہ آرائی کے باعث ضعف و انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اور اب اس وادی پُر فضا میں جیک کا مدِ مقابل نہ رہا۔

جیک کو اب اپنی شجاعت اور مردانگی کے اظہار کا موقع ملا۔ اسکی آواز میں شیروں کی سی گرج تھی۔ بشرہ سے رُعب اور ہیبت کی شعاعیں نکلتیں۔ جنگل کے جانور اسے بچہ شیر سمجھنے لگے۔ جیک بھی اپنی صید افگنی کے کمال دکھا کر ان کے اس خیال کی تائید کرنے لگا۔ خدا نے مجھے تمہارے اوپر حکومت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ یہ مشیت الٰہی ہے۔ تم بے غل و غش اپنے اپنے گھروں میں پڑے رہو۔ میں تم سے کچھ نہ لوں گا۔ اگر کوئی دشمن باہر سے آ جائیگا تو اس سے خود مقابلہ کرونگا۔ میری ذات سے تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ میں تمہیں خواب غفلت سے بیدار نہ کرونگا محض تمہاری خدمت کرنے کے صلہ میں کبھی کبھی تم میں سے کسی کا شکار کر لیا کروں گا۔ اس ذرا سی تکلیف

سے تم اپنے ملک کے تحفظ کے بارے سبکدوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں انصاف کرو۔ میرا یہ مطالبہ انصاف سے بعید تو نہیں ہے۔ کیونکہ گو میں آسمانی وجود ہوں۔ پر مجھے بقائے حیات کے لئے خوراک کی ضرورت ہے۔

(۳)

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جیک کو ایک نئی فکر پیدا ہوئی۔ اس خطہ میں کوئی میرا رقیب نہ آ جائے۔ وہاں کے باشندوں سے اسے مدد کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ملک داری کا سارا بار اپنے ہی قوتِ بازو پر تھا۔ اس کے لیل و نہار اب تشویش میں گذرنے لگے۔ جوں جوں دن گذرتے تھے اس کا احتمال ضرور بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دو پتے کے کھڑکنے پر چونک پڑتا۔ اور اپنی صدائے مہیب سے سارے خطے میں تلاطم برپا کر دیتا۔ لقمۂ لطیف اور خواب شیریں کا مزہ جاتا رہا کبھی کبھی مایوسی کے عالم میں جانوروں سے کہتا۔ خدا کا شکر کرو۔ کہ تم میرے منقاد ہو۔ ورنہ کسی دوسرے خونخوار فرمانروا کے مطیع ہوتے تو تمہاری زندگی وبال ہو جاتی۔ میں تمہارا ہی خواہ ہوں ہمیشہ تمہاری بہبود اور فلاح کی فکر میں سرگرم رہتا ہوں۔ کسی دوسرے فرمانروا سے یہ اُمید نہ رکھو۔ جب میں آیا۔ تمہاری حالت کتنی خراب تھی۔ اب دوسرے علاقہ کے جانور تمہاری حالت پر رشک کرتے۔ وادی کے جانور یہ سُن کر کہتے۔ ہم جب تک زندہ رہیں گے۔ آپ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔

بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ جیک کو ایک لمحہ کے لئے سکون نصیب نہ ہوتا۔ وہ ساری رات ندی کے کنارے اس حد سے اُس حد تک چکر لگایا کرتا۔ دوڑتے دوڑتے بے دم ہو جاتا ہانپنے لگتا۔ مگر آرام لینے کی مُہلت کہاں۔ اندیشہ حزر بھوت کی طرح سر پر سوار رہتا تھا

مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ اضطراب اور انتشار اس کے نفس پر عنان کے بدلے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ہم چشموں کو اپنے جاہ و حشم سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب تیوہار کا مہینہ آیا تو شاہان سلف کی روش قدیم کے مطابق اس نے کوچہ عشق کو

ہنگامہ کا انداز بدلنے کا فیصلہ کیا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ اپنے کس بل پر غرور سے اکڑتا ہوا دریا کے پار اُترا۔ اور ایک حسینہ پر ڈورے ڈالنے لگا۔ مئے اُلفت سے سرشار ہو کر اپنے کو ایک لمحہ کے لئے بھول گیا اور اس حسینہ کے نقشِ قدم کو بوسے دیتا ہوا خود مصلحت سے آگے بڑھ گیا۔ رات ہو گئی اور حسینہ اس کی طرف مخاطب نہ ہوئی اسکی ترغیب اور تخویف ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔

حسینہ اسکی دلاوری اور مردانگی کو کسوٹی پر کسے بغیر اسے مُنہ نہ لگانی چاہتی تھی اس کے قد و قامت تن و توش پر اسے اعتبار نہ تھا۔ اسی ارادہ سے وہ اسے کوچوں اور گلیوں کی خاک چھنواتی۔ بالآخر ایک قصاب کی دکان پر پہنچی۔ جہاں شب و روز حرص و حسد عشق و محبت کے مہرے چھوٹتے رہتے تھے۔ وہ اس علاقہ کے فرمانرواؤں کا جولانگاہ تھا۔ اور دس پانچ نشۂ خودی کے متوالے ہر دم بے خلل و غش اینڈتے رہتے تھے۔ یہ جمگھٹ دیکھ کر ایک بار تقاضائے فطرت سے جیک کے پیروں میں لغزش آئی مگر اپنے شان و شکوہ۔ اختیار و اقتدار کی یاد آتے ہی وہ سنبھل گیا۔ اس کے دل نے کہا میں ان استخواں ربیوں کے مقابلے میں قدم پیچھے ہٹاؤں۔ میں جو وادیٔ امن کا فرمانروا ہوں۔ سورماؤں نے بھی اس کا کس بل دیکھا۔ تھرا اُٹھے۔ وہ یکہ و تنہا ایک گروہ پر بھاری تھا۔ شیر کا سینہ۔ چیتے کی سی آتشیں آنکھیں۔ گینڈے کا سا گٹھا ہوا جسم۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ تنہا پیش قدمی کر سکے۔ مگر غیرت بھی گوارا نہ کرتی تھی۔ کہ ایک بیگانہ وجود دندناتا ہوا ہمارے علاقہ میں گھس آئے اور یوں ہماری بے حرمتی کر کے زندہ و سلامت واپس جائے۔ سبھوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہ تحریک سے دیکھا۔ اُٹھ بیٹھے غیظ و غضب کے چیدہ الفاظ زبان سے نکالے اور تب یکبارگی جیک سے اُلجھ گئے حسینہ نے بھی آئینِ محبت اور وفا کی پرواہ نہ کر کے حریفوں کا ساتھ دیا۔ جیک نے دل کو مضبوط کیا۔ مگر اس کا مُنہ خود بخود سکڑ گیا۔ دانت باہر نکل آئے اور دُم نیچے جھک گئی وہ ایک قدم کے فاصلہ پر

کھڑا ہوگیا اور مدافعت کرنے لگا۔ ایک بار زور سے ڈپٹ کر اُن پر حملہ کرتا تو ساری جمعیت دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ غرض جیک نے اس معرکہ میں مردانگی کی خوب داد دی۔ اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر دیکھیں تو حسینہ کو اسے کم ہمت سمجھنے کی مطلق گنجائش نہ تھی مگر جب شمع سوزاں پر صدہا پروانے گر پڑیں۔ تو شمع کیونکر روشن رہ سکتی ہے جیک اتحادیوں کا مقابلہ تنہا نہ کرسکا۔ مگر وہاں سفید جھنڈی کی قدر کرنے والے رقیب نہ تھے انہوں نے جیک پر اتنے وار کیے کہ محض اسکی سخت جانی اسکی ضامن ہوئی۔ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا۔ جب اب بھی اس نے حریفوں کی آتش قہر کو فرو ہوتے نہ دیکھا تو توکل بخدا راہ فرار اختیار کی۔ اور پھر اسی ندی میں کود کر اپنی جان بچائی۔ پانی میں تیرتا تھا اور اپنی حرارت اور ہوس پر کفِ افسوس ملتا تھا۔ ہاں رہ رہ کر پیچھے کی طرف تاکتا جاتا تھا کہ کہیں دشمن تعاقب نہ کرتا آتا ہو۔

اس دن سے جیک کو اپنی قوت پر جو غرّہ تھا۔ وہ غائب ہوگیا۔ اسے معلوم ہوا کہ باوجود اس حشمت و شوکت کے بازاری غول کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ احتمال ضرر حدت بڑھ گیا۔ خواب و خور حرام ہوگیا۔ ہفتوں گزر جاتے اور طبیعت غذا کی جانب مائل نہ ہوتی۔ کبھی سوچتا۔ انہیں جانوروں کو لڑنا سکھاؤں مگر پھر خوف ہوتا۔ کہیں یہ سب میری تباہی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس نے ان سے مدد لینے کے مقابلہ میں باہر کے دشمنوں کا مقابلہ زیادہ آسان سمجھا۔ ایک روز اسے ایسا وہم ہوا کہ وادی کے سب جانور کسی رقیب سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ اس نے عالم غیظ میں کئی گیدڑوں اور خرگوشوں کو کاٹ کھایا۔ مگر وہم نہ دور ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں حملہ آوروں کی یلغار کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ ندی کے کنارے آیا اور اتنی دیر تک اور اتنے شور سے گرجا کہ اس کا گلا پھٹ گیا۔ شاید پھیپھڑے پر بھی کچھ صدمہ پہنچا۔ سارا دن چکر لگاتے گذر گیا۔ رات گذر گئی۔ پر یلغار کی صدا اس کے کانوں میں پیہم آتی رہی۔ دوسرے دن وادی اس کے

باشندے اس کے پاس گئے احساس وہم کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ بجز حضور کے ادھر صدیوں سے کوئی غنیم آنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اب تو کوئی ادھر نگاہ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ کس کی مجال ہے جو حضور سے آمادۂ پیکاش ہو۔ اور پھر ایسا موقعہ آ بھی جائے تو ہم سب حضور کے قدموں پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ مگر جیک کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ وہ لبِ دریا سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہٹا۔ اپنے دل میں خیال کیا۔ تمہارے نثار ہونے سے مجھے کیا فائدہ۔ میں کس کا شکار کروں گا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ غریب بے خواب و خور بے آب و دانہ۔ مجسم فکر و ابتلا ندی کے کنارے گوئے چوگاں کی طرح ادھر سے اُدھر دوڑتا پھرتا رہا۔ پیر لڑکھڑانے لگے آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ آنتیں سکڑ گئیں۔ اعضا مفلوج سے ہو گئے آٹھویں دن وہ نامرادِ کشتۂ ہوس فکرمند دل لئے ہوئے اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ وادیِ امن کے باشندے اس کی میّت پر جمع ہوئے۔ مگر رونے کے لئے نہیں۔ قیدِ اطاعت سے آزاد ہونے پر خوشی منانے کے لئے۔

خُودی

مُنی جس وقت دلدار نگر میں آئی۔ اس کی عُمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وُہ بالکل اکیلی تھی۔ ماں باپ دونوں نہ معلوم مر گئے یا کہیں پردیس چلے گئے تھے۔ مُنی صرف اتنا جانتی تھی کہ کبھی ایک دیوی اسے کھلایا کرتی تھی۔ اور ایک دیوتا اُسے کندھے پہ لے کر کھیتوں کی سیر کرایا کرتا تھا۔ پر وہ ان باتوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتی تھی۔ گویا اس نے خواب دیکھا ہو۔ خواب تھا یا واقعہ اس کا اسے علم نہ تھا۔ جب کوئی پُوچھتا تیرے ماں باپ کہاں گئے۔ تو وہ بچاری کوئی جواب دینے کے بجائے رونے لگتی اور کبھی سوالوں کو ٹالنے کے لئے ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر کہتی۔ اُوپر۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی۔ وہاں۔ اس اُوپر اور وہاں سے اس کا مطلب کیا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید مُنی کو یہ خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس ایک دن لوگوں نے اُسے ایک پیڑ کے نیچے کھیلتے دیکھا اور اس سے زیادہ اس کی بابت کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی۔ جو اُسے دیکھتا موہ جاتا۔ اسے کھانے پینے کی کچھ فکر نہ رہتی تھی۔ جب کوئی بلا کر کچھ دیتا۔ وہیں کھا لیتی۔ اور پھر کھیلنے لگتی۔ شکل وصورت سے وُہ کسی اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ غریب سے غریب گھر میں بھی اس کے کھانے کو دو لقمے اور سونے کے لیے ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کی کمی نہ تھی۔ وہ سب کی تھی۔ اس کا کوئی نہ تھا۔

اس طرح کچھ دن بیت گئے۔ مُنی اب کچھ کام کرنے کے قابل ہو گئی۔ کوئی کہتا ذرا جا کے تالاب سے یہ کپڑے تو دھو لا۔ مُنی بے عذر دھونے کو چلی جاتی۔ لیکن راستے میں کوئی اسے بلا کر کہتا بیٹی! کنوئیں سے دو گھڑے پانی تو کھینچ لا۔ تو وہ کپڑے وہیں رکھ کر گھڑے لے کر کنوئیں کی طرف چل دیتی۔ کنوئیں پر کوئی کہہ دیتا ذرا کھیت سے جا کر تھوڑا سا ساگ تو لے آ۔ اور مُنی

گھڑے وہیں رکھ کر ساگ لینے چلی جاتی۔ پانی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی۔ کنوئیں پر جا کر دیکھتی ہے۔ تو گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ منّی کو گالیاں دیتی ہوئی کہتی۔ آج سے اس نگل موہی کو کچھ کھانے کو نہ دوں گی۔ کپڑے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور غصہ میں تالاب کی طرف جاتی۔ تو راستہ میں کپڑے پڑے ہوئے ملتے۔ تب وہ بھی اسے گالیاں دے کر کہتی آج سے اسے کچھ کھانے کو نہ دوں گی۔ اس طرح منّی کو کبھی کبھی کچھ کھانے کو نہ ملتا۔ اور تب اسے بچپن یاد آتا۔ جب وہ کچھ کام نہ کرتی تھی۔ اور لوگ اسے بلا کر کھانا کھلا دیتے تھے۔ وہ سوچتی کس کا کام نہ کروں، کسے جواب دوں۔ وہی ناراض ہو جائے گا۔ میرا اپنا کون ہے۔ میں تو سب کی ہوں۔ اس غریب کو یہ نہ معلوم تھا۔ کہ جو سب کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب اسے کھانے پینے کی اور کسی کی خوشی یا خوشی کی پرواہ نہ تھی۔ بختِ سیاہ میں بھی بچپن کا وہ زمانہ چین کا تھا۔ کچھ دن اور گذرے۔ منّی جوان ہو گئی۔ اب تک وہ عورتوں کی تھی۔ اب مردوں کی ہو گئی۔ وہ سارے گاؤں کی معشوقہ تھی۔ پر کوئی اس کا محبوب نہ تھا۔ سب اس سے کہتے تھے میں تم پر مرتا ہوں۔ تمہارے فراق میں تارے گنتا ہوں۔ تم میرے دل و جان کی مراد ہو۔ پر اس کا سچا محبوب کون ہے۔ اس کی اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی اس سے یہ نہ کہتا تھا کہ تو میری رنج و غم کی شریک ہو جا۔ سب اس سے اپنا خانۂ دل آباد کرنا چاہتے تھے۔ سب اس کی نگاہ پر ایک تبسم زیر لب پر قربان ہو جانا چاہتے تھے۔ پر کوئی اس کی بانہہ پکڑنے والا۔ اس کی لاج رکھنے والا نہ تھا۔ وہ سب کی تھی۔ اس کی محبت کے دروازے سب پر کھلے ہوئے تھے۔ پر کوئی اس پر اپنا قفل نہ ڈالتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا کہ یہ اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔

وہ بھولی بھالی لڑکی جو ایک دن نہ جانے کہاں سے بھٹک کر آ گئی تھی۔ اب اس گاؤں کی ملکہ تھی۔ جب وہ اپنا فراخ سینہ ابھار کر غرورِ حسن سے گردن اٹھائے نزاکت سے لچکتی ہوئی چلتی تو منچلے نوجوان دل تھام کر رہ جاتے۔ اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھاتے۔ کون تھا جو اس کے

اشارے پر اپنی جان نثار نہ کر دیتا۔ وہ یتیم لڑکی جسے کبھی گڑیاں کھیلنے کو نہ ملیں۔ اب دلوں سے کھیلتی تھی۔ کسی کو ملاتی تھی۔ کسی کو جلاتی تھی۔ کسی کو ٹھکراتی تھی۔ کسی کو تھپکیاں دیتی تھی کسی سے روٹھتی تھی۔ کسی کو ستاتی تھی۔ اس کھیل میں اُسے سفاکانہ مزا آتا تھا۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ پہلے وہ سب کی تھی۔ کوئی اس کا نہ تھا۔ اب سب اس کے تھے۔ وہ کسی کی نہ تھی اُسے جس چیز کی تلاش تھی۔ وہ کہیں نہ ملتی تھی۔ کسی میں وہ ہمت نہ تھی۔ جو اس سے کہتا۔ آج سے تو میری ہے اس پر دل نثار کرنے والے بہتیرے تھے۔ سچا رفیق ایک بھی نہ تھا۔ اصل میں وہ ان آشفتہ سروں کو حقیر سمجھتی تھی۔ کوئی اس کی محبت کے قابل نہ تھا۔ ایسے پست ہمتوں کو وہ کھلونوں سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی۔ جن کا مرنا اور جلانا ایک دلچسپ مشغلہ سے زیادہ نہیں۔ جس وقت کوئی نوجوان مٹھائیوں کے خوان اور پھولوں کے ہار لئے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو اس کا جی چاہتا۔ منہ نوچ لوں۔ اسے وہ چیزیں زہر ہلاہل سی لگتیں۔ ان کی جگہ وہ روکھی روٹیاں چاہتی تھی۔ سچی محبت میں ڈوبی ہوئی زیوروں اور اشرفیوں کے انبار اسے بچھو کے ڈنک سے لگتے۔ ان کی جگہ وہ سچی دل سے نکلی ہوئی باتیں چاہتی تھی۔ جن میں الفت کی بو اور خلوص کا نغمہ ہو۔ اُسے رہنے کو محل ملتے تھے۔ پہننے کو ریشم۔ کھانے کو غذائے لطیف۔ پر وہ اُن چیزوں کی طالب نہ تھی۔ وہ طالب تھی۔ پھوس کے جھونپڑے۔ موٹے جھوٹے کپڑے اور روکھے سوکھے کھانے کی۔ اسے اثبات روح سوز سے نفی روح پرور کہیں زیادہ مرغوب تھی۔ فضا کے مقابلہ میں کنج قفس کہیں زیادہ مطلوب۔

(۱۳)

ایک دن ایک پردیسی گاؤں میں آ نکلا۔ بہت ہی کمزور خستہ حال آدمی تھا۔ ایک پیڑ کے نیچے ستو کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ دفعتاً تُنی اُدھر سے جا نکلی۔ مسافر کو دیکھ کر بولی۔ کہاں جاؤ گے؟ مسافر نے بے رُخی سے جواب دیا۔ جہنم۔

تُنی نے مسکرا کر کہا۔ کیوں کیا دنیا میں جگہ نہیں۔

اور دوں کے لئے ہوگی۔ میرے لئے نہیں۔

دل پر کوئی چوٹ لگی ہے؟

مسافر نے زہر خندہ کر کے کہا اور بدنصیبوں کی تقدیر میں کیا ہے؟ رونا دھونا اور ڈوب مرنا۔ یہی ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ پہلی دو منزلیں تو طے کر چکا۔ اب تیسری منزل اور باقی ہے کوئی دن وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ ایشور نے چاہا تو بہت جلد۔

یہ ایک چوٹ کھائے دل کے الفاظ تھے۔ ضرور اس کے پہلو میں دل ہے ورنہ غیرت کہاں سے آتی۔ منی بہت دنوں سے دل کی تلاش کر رہی تھی۔ بولی کہیں اور وفا کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟

مسافر نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ میری تقدیر میں نہیں۔ ورنہ میرا کیا بنا بنایا آشیانہ اُجڑ جاتا۔ دولت میرے پاس نہیں۔ حُسن میرے پاس نہیں۔ پھر وفا کی دیوی مجھ پر کیوں مہربان ہونے لگی۔ پہلے سمجھتا تھا وفا دل کے بدلے ملتی ہے۔ اب معلوم ہوا اور جنسوں کی طرح وہ بھی زرو جواہر سے خریدی جا سکتی ہے۔

منی کو معلوم ہوا۔ میری نظروں نے دھوکا کھایا تھا۔ مسافر سیاہ فام نہیں صرف سانولا تھا۔ اس کے خط و خال بھی اُسے دلاویز معلوم ہوئے۔ بولی نہیں یہ بات نہیں تمہارا پہلا خیال صحیح تھا۔

یہ کہہ کر منی چلی گئی۔ اس کے دل کے جذبات اس کی قوت ضبط سے باہر ہو رہے تھے۔ مسافر کسی خیال میں محو ہو گیا۔ وہ اس حسینہ کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کیا سچ سچ یہاں وفا ملے گی؟ کیا یہاں بھی تقدیر فریب نہ دے گی۔

مسافر نے رات اسی گاؤں میں کاٹی وہ دوسرے دن بھی نہ گیا۔ تیسرے دن اس نے ایک پھونس کا جھونپڑا کیا۔ منی نے پوچھا۔ یہ جھونپڑا کس کے لئے بناتے ہو۔

مسافر نے کہا۔ جس سے وفا کی اُمید ہے۔

چلے تو نہ جاؤ گے؟

جھونپڑا تو رہے گا؟

خالی گھر میں بھوت رہتے ہیں۔

اپنے پیارے کا بھوت بھی پیارا ہوتا ہے۔

دوسرے دن مُنی اس جھونپڑے میں رہنے لگی۔ لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا منی اس جھونپڑی میں نہیں رہ سکتی۔ وُہ اس بھولے مسافر کو ضرور دغا دیگی۔ یہ عام خیال تھا۔ لیکن منی پُھولی نہ سماتی تھی۔ وُہ نہ کبھی اتنی حسین نظر آئی تھی نہ اتنی خوش اسے ایک ایسا انسان مل گیا تھا۔ جس کے پہلو میں دل تھا۔

(۳)

لیکن مسافر کو دوسرے دن یہ فکر پیدا ہوئی۔ کہیں یہاں بھی وہی روز سیاہ نہ دیکھنا پڑے۔ حُسن میں وفا کہاں؟ اسے یاد آیا۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ہوئی تھیں ایسے ہی عہد و پیمان ہوئے تھے۔ مگر ان کچے دھاگوں کو ٹوٹتے کتنی دیر لگی۔ وُہ دھاگے کیا پھر نہ ٹوٹ جائیں گے؟ اس مرہم سے بھی اس کے جگر کا زخم نہ بھرا۔ تیسرے دن وُہ تمام دن مغموم اور متفکر بیٹھا رہا۔ اور چوتھے دن وُہ لاپتہ ہو گیا۔ اس کی یادگار صرف اس کی پھوس کی جھونپڑی رہ گئی۔

مُنی دن بھر اس کی راہ دیکھتی رہی۔ اُسے پُرامید تھی وُہ ضرور آئیں گے لیکن مہینوں گذر گئے اور مسافر نہ لوٹا۔ کوئی خط بھی نہ آیا۔ لیکن مُنی کو اُمید تھی وُہ ضرور آئیں گے۔ سال گذر گیا۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ پھُول کھلے۔ پھل لگے۔ کالی گھٹائیں آئیں بجلی چمکی یہاں تک کہ سرما بھی گذر گیا اور مسافر نہ لوٹا۔ مگر مُنی کو اب بھی اس کے آنے کی اُمید تھی۔ وُہ ذرا بھی متفکر نہ تھی۔ ذرا بھی خائف نہ تھی وُہ دن بھر مزدوری کرتی اور شام کو جھونپڑے میں پڑ رہتی۔ لیکن وہ جھونپڑا اب تک محفوظ قلعہ تھا جہاں آشفتہ سروں کا بھی پائے نگاہ لنگ ہو جاتا ہے۔

ایک دن وُہ سر پر لکڑی کا گٹھا لئے چلی آتی تھی۔ ایک رسیا نے چھیڑ خانی کی مُنی کیوں اپنے نازک جسم کے ساتھ یہ ستم کرتی ہو۔ تمہاری ایک نگاہ کرم پر اس لکڑی کے برابر سونا صدقے کر سکتا ہوں۔

مُنی نے روح شکن حقارت کے ساتھ کہا۔ تمہارا سونا تمہیں مبارک ہو۔ یہاں اپنی محنت کا بھروسہ ہے۔

کیوں اتنا اتراتی ہو۔ اب وُہ لوٹ کر نہ آئے گا۔

مُنی نے اپنے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ گیا کہاں جو لوٹ کر آئیگا۔ میرا ہو کر پھر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ وہ میرے سینے میں بیٹھا ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دن عاشق تن نے کہا۔ تمہارے لئے میرا محل حاضر ہے۔ اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں کیا پڑی ہو۔

مُنی نے غرور کے ساتھ کہا اس جھونپڑے پر ایک لاکھ محل نثار ہیں۔ یہاں میں نے وُہ چیز پائی ہے جو اور کہیں نہیں ملی تھی۔ اور نہ مل سکتی ہے۔ یہ جھونپڑا نہیں ہے۔ میرے پیارے کا دل ہے۔

اس جھونپڑے میں مُنی نے ستر سال کاٹے۔ مرنے کے دن تک اُسے مسافر کے لوٹنے کی اُمید تھی۔ اس کی آخری نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس کے خریداروں میں کچھ تو مر گئے۔ کچھ زندہ ہیں۔ مگر جس دن سے وُہ ایک کی ہو گئی۔ اسی دن سے اس کے چہرہ پر وُہ نورانی جلوہ نمودار ہوا۔ جس کی طرف تاکتے ہی نگاہ ہوس بے نور ہو جاتی تھی۔ خودی جب بیدار ہو جاتی ہے۔ تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں۔

مستعار گھڑی

(۱)

میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ لوگ سسرال جاتے ہیں۔ تو نواب بن کر کیوں جاتے ہیں۔ آخر اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ ہم اگر لکھپتی ہیں تو دو دمڑیوں کے محتاج ہیں تو شادی ہو جانے کے بعد اس کرّوفر کا کسی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ شادی کے قبل تو اس کے معنی کچھ ہو سکتے تھے۔ ہماری فرضی خوشحالی حصول مقصد میں بہت کچھ معاون ہو سکتی تھی پردہ پوش ہو سکتی تھی۔ لیکن جب شادی ہو چکی۔ بیگم صاحبہ ہمارے گھر کا کچا چٹھا جان گئیں اور اپنے گھر والوں کو بہ تمام و کمال اپنی کم بختی کی داستان سُنا چکیں تو ہمارا ٹھاٹھ بجز نقصان کے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ہماری بدحالی دیکھ کر ممکن ہے۔ خوشدامن صاحبہ کو کچھ رحم آ جاتا اور رخصتانہ کے بہانے کوئی معقول رقم ہاتھ لگ جاتی جس سے دو چار دن ہم کو بھی امارت کے مزے اُٹھاتے۔ ہمارا یہ کرّوفر دیکھ کر تو وہ یقیناً یہی سمجھیں گی۔ کہ آج کل اس کا ستارۂ اقبال شمسِ ہفتم پہ ہے۔

معلوم نہیں کہیں کوئی دفینہ پا گیا ہے۔ اِدھر نائی اور کہار اور مامائیں الگ انعام و اکرام کے لئے منہ پھیلائینگے مگر یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے میں نے حسب روایات قدیم پچھلی ہولیوں میں سسرال جانے کے واسطے بڑی بڑی تیاریاں کیں۔ ریشمی اچکن اور فلیکس کے بوٹ میری زندگی کے خواب ہائے رنگیں تھے اور شاید خواب ہی رہتے لیکن اس موقع پر میری علو ہمتی نے خواب کو واقعیت کا جامہ پہنا دیا۔ نقد کا سوال ہوتا تو بایں ہمہ علو ہمتی اس خواب کو اصلیت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر ایک دوست کی مہربانی و نوازش نے یہ مشکل آسان کر دی دونوں چیزیں وعدۂ فردا پر مل گئیں چمڑے کا سوٹ کیس ایک دوسرے دوست سے مانگ لایا اور فاؤنٹن

پن ایک تیسرے دوست سے۔ دری پھٹ گئی تھی لیکن بچھاون لے جانیکی میں نے ضرورت نہ سمجھی ورنہ خدا کے فضل سے قالین بھی مستعار مل سکتا تھا۔ ایسے تہوار کے موقعوں پر احباب غیر معمولی طور پر فیاض ہو جایا کرتے ہیں۔ کیونکہ آخر ایک دن انہیں بھی تو یہ پاپڑ بیلنے پڑینگے۔ اب کسر صرف رسٹ واچ کی تھی۔ یوں تو دوستوں میں اکثروں کے پاس رسٹ واچ تھی۔ میرے سوا ایسا بدنصیب کون ہوگا لیکن میں سونے کی گھڑی چاہتا تھا۔ اور وہ صرف دانو کے پاس تھی۔ دانو بابو میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ لیکن ادھر نہ جانے کیوں ان کے یہاں میری آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ آپس میں بےتکلفی نہ تھی۔ دانو روکھا آدمی تھا۔ اور عاریت مثبت یا عاریت منفی دونوں ہی کے خلاف تھے۔ وہ رئیس ہیں۔ اصولوں کی پابندی کر سکتے ہیں۔ ہم کیا پابندی کریں۔ جانتا تھا کہ وہ صرف انکار کرینگے۔ مگر دل نہ مانا۔ خوشامد بڑی چیز ہے۔ اور خاص کر امرا کیلئے۔ اس خداداد عطیہ کی بدولت میں نے اس زندگی میں بڑے بڑے معرکے سر کر دکھائے ہیں۔ اسی کی بدولت آج تیس روپے ماہوار پھٹکارتا ہوں ایک ہزار گریجوایٹوں سے کم امیدوار نہ تھے۔ لیکن سب منہ تاکتے رہ گئے اور اپنی جانب مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر آئے۔ جس نے اتنا بڑا پالا مارا ہو۔ اس کے دوست سے گھڑی لے لینا محال نہ تھا۔ شام کو چلنے کی تیاری کی تھی۔ صبح کو میں دانو کے پاس گیا اور ان کے چھوٹے بچے کو جو سامنے صحن میں کھیل رہا تھا گود میں اٹھا کر لگا بھینچ بھینچ کر پیار کرنے۔ دانو نے پہلے تو مجھے آتا دیکھ کر تیوریاں چڑھائی تھیں لیکن میری محبت دیکھ کر کچھ نرم پڑے۔ ان کے ہونٹوں کے کنارے ذرا پھیل گئے۔ جنہیں شاید مدت دراز کے بعد یہ فراخی نصیب ہوئی تھی۔ بولے۔ "اجی کھیلنے دو پاجی کو۔ سور ہے تمہارا کرتہ میلا ہوا جاتا ہے۔ میں تو اسے چھوتا بھی نہیں"۔

میں نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ "میرا کرتہ میلا ہو رہا ہے تو اس کی تمہیں کیا فکر ہے۔ وہ ایسا پھول سا بچہ اور اسکی یہ قدر۔ تم جیسوں کو ایشور ناحق بچے دیتا ہے۔ تمہیں بھاری معلوم ہوتا ہو۔ تو لاؤ مجھے دے دو۔"

یوں ملامت کر کے میں نے بچے کو کندھے پر بٹھا لیا اور کوئی پندرہ منٹ صحن میں اچھلتا پھرا

بچہ کھلکھلاتا تھا۔ اور مجھے دم نہ لینے دیتا تھا۔ معلوم نہیں اس سواری کا لطف پہلے بھی کبھی حاصل ہوا تھا یا نہیں۔ مگر تھا وہ بے حد خوش۔

دانو نے اسے اتار کر زمین پر بٹھا دیا اور بولے کچھ پان پتا تو لایا نہیں اوپر سے سواری کر بیٹھا۔ جا اماں سے پان بنوا لا۔

بچہ مچل گیا۔ میں نے اسے بہلانے کے لئے دانو کے ہاتھوں دو تین دھپ جمائی اور ان کی رسٹ واچ سے مرصع کلائی کو پکڑ کر بولا۔ لے بیٹا! ان کی گھڑی لے لو۔ یہ بہت مارا کرتے ہیں نہیں۔ آپ تو گھڑی باندھ کر بیٹھے ہیں اور ہمارے منے کے پاس گھڑی ہی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے کلائی پر سے گھڑی کھول کر بچے کی باہنہ پر باندھ دی اور تب اسے گود میں اٹھا کر بولا۔ بھیا اپنی گھڑی ہمیں دے دو۔

سیانے باپ کے بیٹے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بچے نے گھڑی کو دوسرے ہاتھ سے چھپا کر کہا تم کو نہیں دیں گے۔

آخر میں نے اسے بہلا کر گھڑی لے لی۔ اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ بچہ پان لینے چلا گیا۔ دانو بابو اپنی اس بے مثل گھڑی کے اوصاف حسنہ بیان کرنے لگے۔ ایسا سچا وقت بتانے والی گھڑی آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا ہے تو بھی سوس۔

دانو۔ سوس ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ لاکھوں سوس گھڑیاں دیکھ چکا ہوں۔ کسی کو سردی کسی کو زکام کسی کو گنٹھیا کسی کو لقوہ۔ جب دیکھو اسپتال ہیں۔ گھڑی پہچانی جا سکے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کچھ لوگ سمجھتے ہیں اچھی گھڑی اچھے دام دینے سے مل جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں تم گدھے ہو۔ دام خرچ کرنے سے انشیور نہیں ملتا۔ انشیور ملتا ہے گیان سے اور گھڑی بھی ملتی ہے گیان سے۔ بہت سے جہیز دینے سے ور اچھا نہیں ملتا۔ ایسے قیمتی ور اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ فاسٹ صاحب کو تم جانتے ہی ہو گے۔ بس بندہ اسیوں ہی کی کھوج میں رہتا ہے۔ ایک دن شام کو آ کر بیٹھ گیا شراب

کی چاٹ تھی۔ جیب میں روپے ندارد۔ اُن دنوں کو یاد کر کے زار و قطار رونے لگے۔ جب شراب ۸۰ آنے بوتل ملتی تھی۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور ۲۵ روپے میں یہ گھڑی لے لی۔ اس کو تین سال ہوئے ہیں مگر آج تک کبھی ایک منٹ کا فرق نہیں پڑا۔ کوئی اسکی قیمت سو روپیہ آنکتا ہے کوئی دو سو کوئی ساڑھے تین سو۔ کوئی پونے پانچسو۔ مگر میں کہتا ہوں تم سب گدھے ہو۔ ایک ہزار کے نیچے ایسی گھڑی نہیں مل سکتی۔ پتھر پر پٹک دو۔ کیا مجال کہ بال آ جائے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ تب تو یار ایک دن کے لئے مانگی دے دو۔ باہر جانا ہے دوسروں کو بھی اسکی کرامات سناؤں گا۔

دانو۔ مانگے تو میں کوئی چیز نہیں دیتا۔ بھئی یہ میری زندگی کا اُصول ہے کیوں نہیں دیتا۔ اس کا سنانے بیٹھوں تو الف لیلا کی داستان ہو جائے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ عاریت چیز دینا دوستی کی جڑ کھودنا۔ مروت کا گلا گھونٹنا اور اپنے گھر میں آگ لگانا ہے آپ بہت مشتاق معلوم ہوتے ہیں. اسلئے دو ایک واقعہ سنا ہی دوں آپ کو فرصت ہے نا۔ ہاں آج دفتر بند ہے۔ ایک صاحب کئی لالٹینیں عاریت لے گئے لوٹانے آئے تو چمنیاں سب ٹوٹی ہوئیں۔ پوچھا یہ آپ نے کیا کیا۔ تو بولے جناب مجھے چمنیوں سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں جو انہیں توڑ ڈالتا۔ جیسی گئی تھیں ویسی لوٹ آئیں یہ تو آپ نے نہ فرمایا تھا کہ ان کے عوض نئی لالٹینیں لونگا۔ واہ صاحب واہ! یہ اچھا روزگار نکالا اب بتایئے کیا کرتا۔ ایک دوسرے حضرت قالین لے گئے۔ بدلے میں ایک بوسیدہ دری لے آئے پوچھا تو بولے جناب آپ کو تو یہ دری مل بھی گئی ورنہ یہی تو گوڈر والے کے ہاتھ بیچ کر کچھ پیسے کھرے کر لیتے بھلا میں کس کے سامنے جا کر روؤں۔ میری پانچ قالینوں کا پتہ نہیں۔ کوئی صاحب سب کی سب سمیٹ کر لے گئے۔ بتلایئے اُن سے کیا کہتا۔ تب سے ہم نے کان پکڑے کہ اب کسی کو چیز مانگے نہ دوں گا۔ سارا شہر مجھے بے مروت۔ کج خلق سمجھتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہے پر میں پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن آپ میرے عزیز دوست ہیں اس لئے مایوس نہ کروں گا۔

القصّہ میری فتح ہوئی۔ میں یہاں سے کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے چلا۔ تو زمین پر پاؤں

نہ پڑتے تھے۔ گھڑی ملنے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی کہ ایک شاطر پہ فتح پانے کی۔ کیسا پھانسا ہے بچے کو۔ وہ سمجھتے تھے میں بڑا سیانا ہوں۔ یہ نہ جانتے تھے کہ یہاں ان کے بھی گورو گھنٹال ہیں۔

(۳)

اسی دن شام کو سسرال جا پہنچا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ لوگ کیوں سسرال جاتے وقت اتنا ٹھاٹ باٹ بناتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ہلچل پڑ گئی۔ مجھ پر کسی کی نگاہ نہ تھی۔ سبھی میرے سازو سامان پر گرویدہ ہو رہے تھے۔ ایک سالا مٹھائی کی طشتری لایا۔ دوسرا پان کی۔ ناشن جھانککر دیکھ گئی۔ سالیاں بھی چک کی آڑ میں کھڑی ہو گئیں۔ اور خسر صاحب کی تو آنکھوں میں غرور کی سرخی جھلک رہی تھی۔ گویا دنیا کو ان کی نظر انتخاب کی داد دینی چاہیے۔ میں ۳۰ روپے ماہوار کا نوکر یوں شان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے بڑے بابو دفتر میں بیٹھے ہیں۔ کہار پنکھا جھل رہا تھا۔ نائی پاؤں دبا رہا تھا یہ سب اسی کروفر کی کرامات تھی۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

رات کو دیوی جی نے پوچھا۔ سب روپے اڑا آئے کہ کچھ بچا بھی ہے۔

میرا سارا جوشِ الفت سرد پڑ گیا۔ نہ خیر و عافیت نہ محبت کے راز و نیاز۔ شکوے شکایتیں بس ہائے روپے ہائے روپے۔ جی میں آیا۔ اسی وقت اٹھ کر چل دوں۔ لیکن ضبط کر گیا۔ بولا میری آمدنی جو کچھ ہے وہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

میں کیا جانوں تمہاری آمدنی کیا ہے۔ کماتے ہوگے اپنے لئے۔ میرے لئے کیا کرتے ہو۔ تمہیں تو بھگوان نے عورت بنایا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ رات دن کنگھی چوٹی کیا کرتے۔ تم ناحق مرد بنے۔ اپنے شوق سنگار سے بچتا ہی نہیں۔ تم دوسروں کی فکر کیا کروگے؟

میں جھنجلا کر بولا۔ کیا تمہاری یہی مرضی ہے کہ اسی وقت چلا جاؤں۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں تو تمہیں بلانے نہ گئی تھی۔ یا میرے لئے کوئی روگ کر لائے ہو۔

میں نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ تمہاری نگاہ میں محبت کی کوئی قدر نہیں ہے۔ جو

کچھ ہے۔ وہ روکڑ ہی ہے۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ محبت اپنے آپ سے کرتے ہوگے۔ مجھ سے تو نہیں کرتے۔

تمہیں پہلے تو یہ شکایت نہ تھی۔

اس لیے تمہیں یہ تو سمجھ ہی لینا چاہیئے تھا۔ کہ روکڑ کی پرواہ نہیں کرتی لیکن دیکھتی ہوں جوں جوں تمہاری حیثیت بدل رہی ہے تمہارا دل بھی بدل رہا ہے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ تمہاری وہی حالت بنی رہتی۔ میں تمہارے فاقے کر سکتی ہوں۔ چیتھڑے پہن سکتی ہوں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چین کرو۔ اور میں میکے میں پڑی تقدیر کو رویا کروں۔ میری محبت اتنی بے غرض نہیں ہے باہر میری جو قدر و منزلت ہوئی تھی اسے دیکھ کر میں اپنے ٹھاٹ پر پھولا نہ سمایا تھا۔ اب یہاں اتنی بے قدری دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ ناحق یہ سوانگ رچا۔ اگر معمولی کپڑے پہنے روتی صورت بنائے آتا تو باہر والے چاہے سرد مہری سے پیش آتے۔ دیوی جی تو خوش ہوتیں۔ یہ اب تو خفا ہو گئی۔

دیوی جی کی باتوں پر میں نے غور کیا تو مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی۔ اگر وہ مرد ہوتیں اور میں عورت ہوتا تو کیا مجھے یہ گوارا ہوتا کہ وہ تو چھیلا بنی گھومیں اور میں پنجرے میں بند دانہ اور پانی کو ترسوں۔ مناسب تو یہ تھا کہ دیوی جی سے اپنی فرضی ہستی کا سارا راز کہہ سناتا۔ پر مردانہ خودداری نے اسے کسی طرح قبول نہ کیا۔ اگر یہ سوانگ بھرنا غلطی تھی تو اس کا پردہ کھولنا ناقابل عفو گناہ تھا۔ آخر میں نے پھر اسی چرب زبانی سے کام لینے کا فیصلہ کیا جس نے اس سے زیادہ نازک موقعوں پہ میری حمایت کی تھی۔ محبت سے لبریز آواز میں بولا۔ جانِ من میری حالت اب بھی حسب سابق ہے لیکن تمہارے دیدار کا اشتیاق کھینچ لایا دوستوں سے قرض لے کر یہ ساری چیزیں مول لیں۔ پھٹے حالوں آنے میں یہ خیال مانع ہوا کہ سب سے زیادہ رنج تمہیں ہوگا۔ اپنی حالت جو کچھ ہے وہ تو ہے ہی۔ اس کا ڈھنڈورہ پیٹنا اور بھی شرمناک ہے۔

دیوی جی پگھل کر بولیں تو قرض لیا ہوگا۔

اور نقد یہاں دھرا تھا

گھڑی بھی اُدھار ہی

ہاں ایک دوست کی دکان سے لے لی

کتنے کی ہے ؟

باہر کسی نے پوچھا ہوتا تو میں نے پانسو سے کوڑی کم نہ بتلایا ہوتا۔ لیکن یہاں ۲۵ روپیہ ہی بتلانا مصلحت تھی۔

تب تو بڑی سستی مل گئی۔

اور نہیں۔ میں پھنستا ہی کیوں۔

مجھے دیتے جانا۔

ایسا معلوم ہوا کہ میرے جسم میں خون کی حرکت بند ہو گئی۔ سارے اعضاء مفلوج سے ہو گئے۔ انکار کروں تو مارا جاؤں منظور کروں تو بگڑا جاؤں عجیب مصیبت میں جان پھنسی آج صبح یہ گھڑی پا کر میں پھولا نہ سماتا تھا۔ اس وقت وہ ایسی معلوم ہوئی کہ کوڑیالا کنڈلی مار بیٹھا ہے۔ بولا تمہارے لئے کوئی اچھی سی گھڑی لے دوں گا۔

جی نہیں معاف کیجئے۔ آپ ہی اپنے لئے اچھی سی گھڑی لے لیجئے۔ مجھے تو یہی اچھی لگتی ہے کلائی پر باندھے رہونگی جب جب میں اسے دیکھونگی تمہاری یاد آ جائیگی۔ رام جانے تم نے آج تک مجھے کانی کوڑی بھی نہیں دی۔ اب انکار کروگے تو پھر کوئی اور چیز مانگوں گی۔

اس دھمکی سے مجھے کوئی خاص پریشانی نہ ہونی چاہئے تھی بلکہ دل میں خوش ہونا چاہئے تھا کہ زندگی کو ایک بلائے عظیم سے نجات ملی۔ پر نہ جانے کیوں میں بدحواس ہو گیا کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بولا پیاری گھڑی کیا چیز ہے تمہارے لئے جان حاضر ہے لاؤ تمہاری کلائی پر باندھ دوں لیکن بات یہ ہے کہ وقت کا ٹھیک اندازہ نہ ہونے سے کبھی کبھی دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی اور پھٹکار سننا پڑے گی۔ گھڑی تمہاری

ہے۔ لیکن جب تک اُدھر دوسری گھڑی نہ لے لوں اسے پاس رہنے دو۔ میں بہت جلد کوئی سستے داموں کی گھڑی لیے لیتا ہوں اور تمہاری گھڑی تمہارے ہاں پھیر دوں گا۔ اس میں تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

دیوی نے میری کلائی سے گھڑی کھولتے ہوئے کہا۔ رام جانے تم بڑے چکمے باز ہو۔ پر یہاں کوئی ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ دو چار دن میں دوسری گھڑی لے لینا۔ اس عرصہ میں ذرا سویرے دفتر چلے جانا۔

مجھے وقت کا اندازہ ہی نہیں۔ سچ کہتا ہوں کے بجے صبح ہوتی ہے اور کے بجے شام اس کا مجھے آج تک علم نہ ہوا۔

تو کسی یار دوست سے مانگ کر کام چلانا۔ میں تو اب نہ دوں گی۔

اب میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ کلائی پر سے گھڑی کھلتے ہی دل پر فکر کا ایک پہاڑ سا آ بیٹھا۔ دانو کو کیا جواب دوں گا۔ یہ سوال کسی اندرونی درد کی طرح دل کو مسلنے لگا۔

(۴)

جب تیسرے دن میں نے دانو بابو سے بچشم پُرنم کہا کہ گھڑی تو کہیں کھو گئی تو وہ تسکین یا تشفی دینے کے بدلے بڑی بے مروتی سے بولے۔ اسی لئے میں تمہیں گھڑی نہ دیتا تھا۔ میرے پاس وہ گھڑی تین سال رہی۔ ایک دن بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئی۔ تم نے تین دن میں اس کا وارا نیارا کر دیا۔ خوب! ہو بڑے جوانمرد۔۔ کہاں گئے تھے!

میں دل میں ڈر رہا تھا کہ خدا جانے کیا آفت آئے گی۔ دانو شاید سینکڑوں صلواتیں سنائیں گا۔ مار بھی بیٹھے تو تعجب نہیں۔ دل کڑا کئے ہوئے تھا۔ یہ دوستانہ تنبیہ مجھے بہشتی ابرِ امید نظر آئی۔ ذرا تشفی ہوئی۔ بولا۔ ذرا سسرال چلا گیا تھا۔

تو بھابی جان کو لوا لائے۔

جی ہاں۔ بھابی جان کو لوا لایا۔ اپنا گذر تو ہوتا نہیں۔ بھابی جان کو کیسے لاتا۔

آخر تم اتنا کماتے ہو۔ سب کا سب کیا کرتے ہو؟

کماتا ہوں کیا۔ اپنا سر۔ تیس ہی روپے تو . . . . .

تو تیسوں ہی خرچ کر ڈالتے ہو۔

کیا تیس میرے لیے بہت ہیں۔

جب تمہاری آمدنی تیس روپیہ ہے تو یہ سب کہیں اپنے اوپر خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ بیوی کب تک میکے پڑی رہے گی؟

جب تک کچھ ترقی نہیں ہوتی مجبوری ہے۔ کس برتے پر لاؤں۔

اور ترقی دو چار سال نہ ہو تو؟

وہ تو ایشور ہی نے کہا ہے۔ ادھر تو ایسی کوئی امید نہیں ہے۔

شاباش تب تو تمہاری پیٹھ ٹھونکنی چاہیئے اور کوئی کام کیوں نہیں کرتے صبح کو بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو؟

سارا وقت نہانے دھونے کھانے پینے میں صرف ہو جاتا ہے۔ پھر یار دوستوں سے ملنا جلنا بھی ہے۔

تو بھئی تمہارا مرض لا دوا ہے۔ ایسے فضول آدمی کے ساتھ مجھے شمہ بھر ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری گھڑی پانسو روپیہ کی تھی۔ اتنے روپے آپ کو دینے ہونگے آپ اپنے لئے پندرہ روپیہ رکھ کر باقی پندرہ روپیہ میرے حوالے کرتے جائیے۔ تیس مہینے یا اڑھائی سال میں میرے روپے پٹ جائیں۔ تب جی کھول کر دوستوں سے ملئے سمجھ گئے۔ میں نے ۵۰ روپے چھوڑ دیئے۔ اس سے زیادہ رعایت میں نہیں کر سکتا۔

میں نے رونی صورت بنا کر کہا۔ پندرہ روپے میں میرا کیسے گذارہ ہوگا۔

گذارہ تو پانچ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور پانسو میں بھی۔ اس کی نہ پوچھو۔ اپنی اپنی حیثیت ہے۔ دانو بابا نے جس بے رخی اور بے اعتنائی سے یہ باتیں کہیں۔ ان سے مجھے یقین ہو گیا کہ

اب ان کی اور منت سماجت کرنی پڑے گی۔ یہ حضرت اپنی پوری رقم لئے بنا نہ جائیں گے۔ گھڑی میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ دو سو کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلے ہی اس کی قیمت مجھے بتا دی تھی۔ اس امر میں اب قیل و قال کی گنجائش نہیں۔ قسمت ٹھونک کر گھر آیا۔ یہ شادی کرنے کا مزا ہے۔ اس وقت کتنا خوش تھا۔ گویا نعمت عظمیٰ ہاتھ لگ رہی ہے۔ اب نانی کے نام کو روؤں۔ گھڑی کا شوق چرایا تھا۔ اس کا خمیازہ اٹھاؤ۔ نہ گھڑی کلائی پر باندھ کر چلتے تو ایسی کون سی کرکری ہو جاتی تھی۔ مگر تم اس وقت کس کی سننے لگے تھے۔ اب دیکھیں پندرہ میں کیسے گزر کرتے ہو۔ تیس میں تو پورا ہی نہیں پڑتا تھا۔ اب پندرہ میں تم کیا کرو گے؟ انہیں تفکرات میں پڑا پڑا سو گیا۔ کھانے کی بھی سدھ نہ رہی۔

(۱۴)

اب ذرا سنیے کہ ۳۰ روپے میں کیسے گزر کرتا تھا۔ لطف کی بات ہے اب تک ۲۰ روپیہ میں ہوٹل کے دیتا تھا۔ دس روپیہ میں ناشتہ، دھوبی، نائی، پان، تمباکو، سگریٹ، دوست احباب کی خاطر، چائے، کپڑا، جوتا، سر کا تیل سب کچھ۔ آپ کون شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایسی کونسی فضول مد تھی۔ جس میں کفایت کرتا۔ تیس روپیہ میں ہی مشکل سے مہینہ ختم ہوتا تھا۔ اب ۱۵ روپے میں کیسے نبھے گی۔ یہ خیال کر کے میں رو پڑا۔ مگر دانو کا قرض چکانا تھا۔ رد کر چکا تھا۔ یا ہنس کر۔ ایک بار جی میں آیا کہ سسرال جا کر گھڑی اٹھا لاؤں۔ لیکن دانو سے کہہ چکا ہوں کہ گھڑی کھو گئی۔ اب گھڑی لے کر جاتا تو وہ مجھے منتقی اور جھوٹا کہتے۔ میں نے سوچا کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو سمجھا تھا گھڑی کھو گئی۔ لیکن سسرال گیا تو پتہ چل گیا میری بیوی نے اڑا لی تھی۔ ہاں چال تو بری نہیں تھی۔ لیکن دیوی جی سے کیا بہانہ کرتا۔ گھڑی پا کر وہ کتنی خوش ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ساری دنیا کی دولت ہاتھ آ گئی ہے۔ اب جا کر گھڑی چھین لاتا تو شاید میری صورت بھی نہ دیکھتی۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ دانو بابو کے پاس جا کر رونے لگتا۔ آخر غصہ میں انہوں نے سخت سست کہا ہے۔ دو چار دن کے بعد جب غصہ فرو ہو جائے گا

تو انہیں ضرور مجھ پر رحم آ جائے گا۔ بچپن کی دوستی کیا اتنا اثر بھی نہیں دکھائے گی لیکن میں بے غیرت نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی دن ایک بہت سستے ہوٹل میں اُٹھ گیا۔ ہوٹل تو نام تھا۔ تھا وہ ایک چڑیا خانہ بارہ روپیہ میں انتظام ہو گیا۔ دس کھانے کے اور دو مکان کے۔ ناشتہ کے لئے دودھ اور چائے کی جگہ ایک آنے کے چنے لا کر رکھ دیئے۔ اوپر کے مصارف کیلئے تین روپیہ رکھ لئے صاف ١٥ بچ گئے یعنی نفس کشی کی تھی۔ تپسیا سمجھ لو۔ نہ پان نہ سگرٹ۔ نہ چائے نہ مٹھائی نہ لیموں شربت نہ برف نہ کسی کے آنا نہ جانا۔ پورا سنیاس تھا۔ خواہشیں بار بار اُٹھتی تھیں لیکن حباب کی مانند اپنی بے بضاعتی کے احساس سے بیٹھ جاتی تھیں۔ جب میں نے مہینہ کے آخر میں ١٥ روپیہ لے کر دادا بابو کو دیئے تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ کئی اُنگل لمبا ہو گیا ہوں۔ ایسی پُر غرور مسرت مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

دادا نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ بچائے یا کسی سے مانگ لائے۔

بچائے ہیں مانگتا کس سے۔

کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

میں نے ستم ظریفانہ انداز سے کہا۔ بالکل نہیں۔ بالکل بادشاہوں کی طرح بسر ہوئی ہے۔

صبح کو تو اب بھی خالی رہتے ہو۔ کیوں آمدنی بڑھانے کی فکر نہیں کرتے۔

فکر تو بہت کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس میں غرق ہو جاتا ہوں۔ وہ بجائے خود ایک کام ہو گیا ہے۔ لیکن کوئی صورت نہیں پیدا ہوتی۔

یہاں سے لوٹا تو مجھے اپنے دل میں ایک نئی قوت ایک مردانہ حوصلہ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بے کسی جو دل پر مسلط رہتی تھی۔ غائب ہو گئی۔

مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ جن خواہشات کا روکنا میرے لئے امر محال تھا ان کی طرف اب خیال بھی نہ جاتا تھا۔ جب پان کی دکان پہ پہنچا دل بیقرار ہو جاتا تھا اس طرف سے

میں اب یوں سر اُٹھائے نکل جاتا تھا۔ گویا پان کھانا نفاقوں کا کام ہے۔ میرے لئے سخت معیوب
سگرٹ چائے چاٹ کسی چیز کی طرف دل مائل نہ ہوتا تھا۔ صبح کو بھیگے ہوئے چنے۔ دونوں وقت روٹی
اور دال۔ بس اس کے سوا میرے لئے دُنیا کی اور سب چیزیں ممنوع تھیں۔ میں ان کی طرف آنکھیں
اُٹھا کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب مجھے زندگی سے خاص اُلفت ہوگئی تھی۔
افلاس میں موت کی دعوت کہاں سے دیتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں زندگی میں کچھ کر سکتا ہوں۔
ایک دن ایک دوست نے مجھ سے پان کے لئے اصرار کیا۔ میں نے انکار کیا تب وُہ بولے۔ تم نے پان
چھوڑ کر کمال کر دیا۔ میں قیاس بھی نہ کر سکتا تھا کہ تم پان چھوڑ دو گے۔ ہمیں بھی کوئی ترکیب بتاؤ کہ اس
بلا سے نجات ملے۔

میں نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر کہا۔ اسکی ترکیب یہی ہے کہ پان نہ کھاؤ۔

جی تو نہیں مانتا۔

آپ ہی مان جائے گا۔

سگرٹ کے بغیر تو پیٹ پھولنے لگتا ہے۔

پھولنے دو۔ آپ پچک جائے گا۔

اچھا تو لو آج سے میں نے پان اور سگرٹ دونوں چھوڑ دیئے۔

تم کیا چھوڑو گے غیر ممکن

میں نے انہیں اشتعال دلانے کے لئے یہ تعرض اختیار کی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔
وُہ گرم ہو کر بولے۔ اگر تم چھوڑ سکتے ہو۔ تو میں بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ تم سے کسی بات میں کم نہیں ہوں۔

اچھی بات ہے دیکھوں گا۔

دیکھ لینا۔

میں نے آج تک پان یا سگرٹ کا شوق کرتے نہیں دیکھا۔

چار مہینے نکل گئے۔ دتو بابو کی ماہوار قسط میں ایک دن کی بھی دیر نہ ہوئی۔ پانچویں مہینے
میں جب روپئے تہ کر گیا تو وہ ٹوٹ کر میرے گلے سے لپٹ گئے۔ اور بولے یار تم دُھن کے

بچّے۔ مگر سچ کہتا ہوں مجھے دل میں کوستے تو نہیں ہو؟

میں نے ہنس کر کہا۔ اب تو نہیں کوستا۔ لیکن پہلے ضرور کوستا تھا۔

اب کیوں رعایت کرنے لگے؟

اس لئے کہ مجھ جیسے خانہ خراب آدمی کو جس طرح رہنا چاہیئے وہ تم نے مجھے سکھا دیا میری آمدنی میں نصف میری بیوی کی ہے۔ پر اب تک میں اس کا حصہ بھی ہضم کر جاتا تھا اور پھر بھی سیر نہ ہوتا تھا۔ اب میں اس قابل ہو رہا ہوں کہ اس کا حصہ اسے دیدوں یا بلا کر اپنے ساتھ رکھوں۔ تم نے مجھے بہت اچھا سبق دیا۔

اگر تمہاری آمدنی کچھ بڑھ جائے تو پھر وہی وطیرہ اختیار کرو گے؟

ہرگز نہیں۔ بیوی کو بلا لوں گا۔ یہ کتنی بے حیائی ہے کہ میری بیوی دوسروں کے ہاں پڑی ہے۔

اچھا تو خوش ہو جاؤ۔ تمہاری ترقی ہو گئی۔

مجھے یقین نہ آیا۔ بولا میری ترقی کیسے ہو گی۔ ابھی مجھ سے پہلے والے ناک رگڑ رہے ہیں کہتا ہوں۔ ہاں چاہئے مجھ سے تمہارے بڑے بابو کہتے تھے۔

مجھے اب بھی یقین نہ آیا۔ لیکن فرطِ مسرت سے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ اِدھر داتو بابو رخصت ہوئے اُدھر میں بڑے بابو کے گھر پہنچا۔ بابو صاحب بیٹھے اپنی بکری دوہ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو جھینپتے ہوئے بولے۔ کیا کروں بھائی۔ آج گوالا نہیں آیا (بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی گوالا نہ تھا) اس لئے یہ بلا گلے پڑی۔ چلو بیٹھو۔

میں کمرے میں جا بیٹھا۔ بابو جی کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد بھلے آدمی بنے ہوئے ہاتھ میں گڑگڑی لئے باہر نکلے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ بولا میں نے سُنا ہے میری ترقی ہو رہی ہے؟

داتو بابو نے کہا ہو گا؟

جی ہاں۔ ابھی کھلنے مگر میرا نمبر تو آیا نہیں۔ ترقی کیسے ہوئی؟

یہ نہ پوچھو۔ افسروں کی نگاہ چاہیئے۔ نمبر کون پوچھتا ہے۔

لیکن آخر موقع کونسا ہے۔؟

ہم دیا بھائی! افسر لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ صاحب ایک دوسری مد سے تمہیں ۱۵ روپے زیادہ دینا چاہتے ہیں۔ دلّو بابو نے تو خود ان سے تمہاری سفارش کی ہے۔

کسی دوسرے کا حق چھین کر تو مجھے یہ روپے نہیں دیئے جا رہے ہیں؟

نہیں یہ بات نہیں۔ میں خود اسے منظور نہ کرتا۔

مہینہ گزر گیا۔ مجھے ۵۰ ملے مگر رجسٹر میں میرے نام کے سامنے وہی تیس لکھے تھے بڑے بابو نے تخلیہ میں بلا کر مجھے روپے دیئے۔ اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا ورنہ داویلا مچ جائیگا

میں خوش خوش روپے لئے دلّو بابو کے گھر پہنچا وہ میری باچھیں کھلی دیکھ کر بولے مار لائے ترقی۔ کیوں؟

ہاں یار روپے تو ۵۰ ملے مگر ترقی نہیں ہوئی۔ کسی اور مد سے دیئے گئے ہیں۔

اجی تمہیں روپے سے مطلب ہے یا مد سے۔ تو اب بھابی کو بلا لاؤ گے نہ؟

نہیں ابھی نہیں!

تم نے تو کہا تھا ترقی ہو جائے گی تو بیوی کو لاؤں گا۔ اب کیا ہو گیا؟

میں سوچتا ہوں۔ پہلے آپ کے روپے ادا کر دوں۔ اب کے تیس روپے کی قسط ہو گی سال بھر میں روپے پٹ جائیں گے۔ تب آزاد ہو جاؤں گا۔

دلّو بابو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ حضرت میٹھے بیر کی طرح اوپر سے روکھے اور اندر سے شیریں تھے۔ بولے نہیں بھئی اب کے مجھے کچھ مت دو۔ ریل کا خرچ کہاں سے لاؤ گے۔ جا کر بھابی کو لے آؤ۔

میں نے دبدھے میں پڑ کر بولا۔ یار! ابھی نہ مجبور نہ کرو۔ شاید قسط ادا نہ کر سکوں

دانو بابو نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی گھڑی کے دام پا چکا۔ میں نے تو اُسے چھ پیسے ہی میں لیا تھا۔ اور تین سال تک کام لے چکا۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا چاہیئے تھا۔ اپنی خود غرضی پر نادم ہوں۔

میری آنکھیں بھر آئیں۔ جی میں آیا کہ گھڑی کا ماجرا اُن کو سنا دوں۔ لیکن ضبط کر گیا بولا نہیں دانو بابو۔ مجھے روپے ادا کر لینے دو۔ آخر تم اس گھڑی کو چار یا پانسو میں بیچ لیتے یا نہیں۔ میرے باعث تمہیں اتنا نقصان کیوں ہو؟

بھئی اب گھڑی کا ذکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ کب جاؤ گے؟

ارے مکان تو پہلے ٹھیک کر لوں۔

تم جاؤ۔ میں مکان کا انتظام کر دوں گا۔

مگر میں ۵ سے زیادہ کرایہ نہ دے سکوں گا۔ شہر سے ذرا ہٹ کر مکان سستا مل جائیگا۔

اچھی بات ہے میں ٹھیک کر لوں گا۔ کس گاڑی سے لوٹو گے؟

یہ ابھی کیا معلوم۔ رخصتی کا معاملہ ہے۔ ساعت بنے یا نہ بنے۔ تم اس اُلجھن میں کیوں پڑو گے۔ دو چار دن میں مکان کا انتظام کر کے چلا جاؤں گا۔

جی نہیں آپ آج جائیے۔ اور کل آئیے۔ میرا آدمی تمہیں سٹیشن پر ملیگا۔

میں نے بہت حیلے حوالے کئے۔ مگر اس بھلے آدمی نے ایک نہ سُنی۔ مجھے اُسی دن سُسرال جانا پڑا۔

(۵)

مجھے سُسرال میں تین دن لگ گئے چوتھے دن دیوی جی کے ساتھ رخصت ہُوا۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں دانو بابو نے اسٹیشن پر کوئی آدمی نہ بھیجا ہو۔ تو کس کے گھر جاؤں گا۔ آج چوتھا دن ہے۔ انہیں اتنی غرض کیا پڑی ہے۔ کہ بار بار آدمی بھیجیں۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت خیال آیا۔ تار دے دوں۔ لیکن بار بار آنے کا سوال مانع ہُوا۔

مگر جب گاڑی بنارس پہنچی تو دیکھتا ہوں۔ دانو بابو خود ہیٹ ویٹ لگائے دو قلیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑے اور بولے سسرال کی مٹھائیاں بہت پیاری لگ رہی تھیں کیا؟ تین دن سے روز دوڑ رہا ہوں۔ جرمانہ دینا پڑے گا۔

دیوی جی سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا جلدی سے تانگے پر بیٹھ کر چل دوں۔ گھڑی ان کی کلائی پر بندھی تھی۔ ڈرتا تھا کہیں دانو کی نظر اس پر نہ جا پڑے۔ مگر تقدیر کے نوشتے کو کون ٹال سکتا ہے۔ میں دیوی جی سے دانو کی قصیدہ خوانی کر چکا تھا۔ اب جو دانو ان کے قریب آ کر صندوق اٹھوانے لگا تو دیوی جی نے دونوں ہاتھوں سے انہیں نمسکار کیا۔ دانو نے گھڑی دیکھ لی۔ اس وقت تو کیا بولتے لیکن جونہی ہم دونوں دوسرے تانگے پر بیٹھ کر چلے تو دانو نے مسکرا کر کہا۔ کیا گھڑی دیوی جی نے چھپا دی تھی

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ نہیں بابو میں ہی دے آیا تھا۔ دے کیا آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔

تو تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولے؟

پھر کیا کرتا؟

اگر تم صاف صاف کہہ دیتے تو شاید میں اتنا کمینہ نہ تھا کہ تم سے اس کا تاوان لیتا لیکن خیر ایشور کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ تمہیں کچھ دنوں ایسی تپسیا کی ضرورت تھی

مکان کہاں ٹھیک کیا ہے۔

وہیں تو چل رہا ہوں

کیا کہیں تمہارے گھر کے قریب ہے۔ تب تو کرایہ بہت ہوگا۔

نہیں میرے گھر سے ملا ہوا ہے مگر سستا۔

دونوں تانگے دانو بابو کے دروازے پر رکے۔ آدمیوں نے دوڑ کر اسباب اتارنا شروع کیا۔ ایک لمحہ میں دانو کی اہلیہ نے آ کر دیوی جی کو تانگے سے اتارا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ساری باتیں پہلے

سے ہی طے ہو چکی تھیں۔

میں نے کہا تو پھر یہ کہو کہ ہم تمہارے بن بلائے مہمان ہیں۔

اب تم اپنی مرضی کا کوئی مکان ڈھونڈ لینا۔ دس پانچ دن تو یہیں رہو لیکن مجھے یہ زبردستی کی مہمانی اچھی نہیں لگی۔ میں نے تیسرے ہی دن ایک مکان تلاش کر لیا چلتے وقت داتو نے ۱۰۰ روپے لے کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ اور کہا یہ تمہاری امانت ہے لیتے جاؤ۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ میری امانت کیسی؟

۵ روپے کے حساب ۹۰ تم نے جمع کئے اس پر دس روپیہ بنک کا سود۔

مجھے داتو کی یہ دوست نوازی بوجھ معلوم ہوئی۔ بولا تو تمہاری گگڑی کو لٹا دوں۔

پھر تم نے گگڑی کا ذکر کیا۔ اس کا نام مت لو۔

تم مجھے چاروں طرف سے دبانا چاہتے ہو۔

ہاں دبانا چاہتا ہوں۔ تمہیں آدمی بنا رہا ہوں۔

تو آپ میرے اُستاد ہیں۔

جی ہاں! ایسے اُستاد کی تمہیں ضرورت تھی۔

میں نے مجبور ہو کر کہا تو بیچو گگڑی؟

پھر تم نے گگڑی کا نام لیا

تم خود مجھے مجبور کر رہے ہو۔

بھابی جان کو میری نذر ہے۔

اور یہ سو روپیہ مجھے انعام ملے ہیں۔؟

جی ہاں۔ یہ امتحان میں پاس ہونے کا انعام ہے۔

تب تو ڈبل انعام ہوا۔

تمہاری تقدیر بھا اچھی ہے۔ میں کیا کروں۔

میں نے یہ روپے سیونگ بنک میں جمع کر دیئے۔ دس مکان کا کرایہ تھا۔ تیس گھر کا خرچ اور پانچ بچت۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دانو نے مجھ سے یہ تپسیا نہ کرائی ہوتی تو میں نہ جانے کتنے تک آوارہ خانماں خراب بنا رہتا۔ اسی تپسیا کی بدولت اب زندگی آرام سے کٹ رہی ہے۔ مگر گھوڑی کا قصہ میں آج تک دیوی جی سے نہ کہا۔

پانچ مہینے کے بعد میری ترقی ہوئی۔ فرضی ترقی نہیں اصلی ترقی۔ ڈر رہا تھا کہ بالائی مد والے ۱۵ روپے ملتے ہیں یا نہیں۔ تنخواہ مل جانے پر بھی کئی منٹ تک کشمکش و پیچ کی حالت میں کھڑا رہا۔ جب اور لوگ چلے گئے تو بڑے بابو نے فرمایا۔ کیا ابھی لالچ گھیرے ہوئے ہے۔ اور اب اور کچھ نہ ملیگا۔

میں نے نادم ہو کر کہا۔ جی نہیں اس خیال سے نہیں کھڑا ہوں۔ صاحب نے اتنے دنوں میری پرورش کی۔ یہ کیا تھوڑا ہے۔ مگر کم سے کم یہ تو بتا دیجئے کہ کس مد کے روپے تھے۔

پوچھ کر کیا کروگے؟

کچھ نہیں یونہی جاننے کو جی چاہتا ہے۔

جا کر دانو بابو سے پوچھو۔

دفتر کا حال دانو بابو کو کیا معلوم

نہیں یہ حال وہی جانتے ہیں۔

میں ہوا کے گھوڑوں پر سوار دانو بابو کے گھر پہنچا۔ اس عقدہ کو کھولے بغیر اب میرا زندہ رہنا محال تھا۔ دانو نے حیرت سے پوچھا۔ خیریت تو ہے۔ کہاں سے بھاگے آ رہے ہو؟

میں نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ میرے یہاں تو سب خیریت ہے۔ لیکن تمہاری خیریت نظر نہیں آتی۔

کیوں بھائی میں نے کیا خطا کی ہے؟

میں نے اپنا سوال پیش کیا۔ دانو نے مسکرا کر کہا۔ بڑے بابو سے نہیں پوچھا۔
تمہارے دفتر کا حال بھلا میں کیا جانوں۔

دیکھو دانو۔ مجھ سے اڑو گے تو اچھا نہ ہوگا۔ کیوں ناحق میرے ہاتھوں پٹو گے

پٹنا چاہو تو پٹ لو بھئی۔ سینکڑوں بار پیٹا ہے۔ ایک بار اور سہی۔ پاؤں پر سے جو دھکیل دیا تھا۔ اس کا نشان اب تک باقی ہے۔ یہ دیکھو۔

تم ٹال رہے ہو۔ اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔ سچ بتاؤ۔ کیا بات تھی؟

بات کچھ نہیں تھی جی۔ محض دل لگی تھی۔ تیس روپے میں ایک آدمی کا گزر ہو سکتا ہے۔ لیکن دو آدمیوں کا گذارہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اور کچھ نہ سہی۔ دونوں وقت روٹیاں تو ہوں۔ بس اتنی بات ہے۔ اب اس کے لئے جو سزا چاہے دو۔ گناہ میرا ہی ہے۔

تالیف

(۱)

پنڈت لیلادھر چوبے کی زبان میں جادو تھا۔ جس وقت وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگتے۔ سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی تقریروں میں خیالات بہت کم ہوتے تھے۔ الفاظ بھی بہت موزوں نہ ہوتے۔ لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا موثر اور دلکش تھا کہ ایک ہی تقریر کو بار بار دہرانے پر بھی اس کا اثر کم نہ ہوتا۔ بلکہ ہر بار قندِ مکرر اور مسئلہ تکرار کا مزہ آتا۔ ہمیں تو یقین نہیں آتا پر سننے والے کہتے ہیں۔ کہ انہیں صرف ایک تقریر یاد ہے۔ اور اسی کو وہ لفظ بلفظ ہر بار نئے انداز سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں کی خاص صفت تھی۔ تفاخرِ قومی وہ حال میں نہیں ماضی میں پرواز کرتے تھے۔ فرداً پرانے زمانے کے ہندو عروج کا نقشہ کھینچ کر لوگوں کو گرویدہ کر لیتے سمجھو! یونان کا مورخ کہتا ہے کہ چندر گپت کے زمانہ میں ہندوستان میں گھروں میں قفل نہیں لگائے جاتے تھے۔ چوری کی وارداتیں معدوم تھیں اور زنا کاری عنقا۔ حضرات اُن سے کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا (چیرز) ہاں اُن کا کبھی کوئی آدمی جوان نہ مرتا تھا۔ باپ کے سامنے بیٹا کا مرنا بعید از قیاس بات تھی۔ غرض موجودہ زمانہ کی نکبت اور زمانہ قدیم کی ثروت اور شوکت کا راگ الاپ کر وہ لوگوں کو متوالا بنا دیتے۔ اسی تاثیرِ زبان کی بدولت ان کی اکابرِ قوم میں شمار تھی۔ خصوصاً ہندو سبھا کے تو وہ ناخدا ہی سمجھے جاتے تھے۔ ہندو سبھائی خادموں میں ایسا جاں نثار دوسرا نہ تھا۔ یوں کہئے کہ سبھا کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ دولت تو اُن کے پاس نہ تھی کم سے کم لوگوں کا خیال ایسا ہی تھا لیکن دماغ اور جوش اور ہمت کا انہوں نے حصّہ وافر پایا تھا اور یہ سب قوم کے نذر تھا۔ شدھی کی تحریک کے تو وہ گویا روحِ رواں تھے

ہندو قوم کی فنا اور بقا کا مسئلہ اب ان کے خیال میں شدھی کی تحریک پر آ رکا ہوا تھا۔ شدھی کے سوا اب کوئی دوسری صورت ان کے زندہ رہنے کی نہ تھی۔ قوم کی ساری اخلاقی جسمانی ذہنی تمدنی مالی مصیبتوں کا دفعیہ اسی تحریک کی کامیابی میں تھا۔ اور وہ اس میں دل و جان سے کوشاں رہتے تھے۔ چندہ وصول کرنے میں چوبے جی کو ید طولیٰ تھا۔ ایشور نے وہ طاقت عطا کی تھی کہ پتھر سے تیل نکال لیتے تھے۔ کنجوسوں کو تو وہ ایسا الٹے استرے سے مونڈتے تھے کہ انہیں زندگی بھر کے لئے سبق مل جاتا تھا۔ کان پکڑتے کہ اب کسی تحریک کے قریب نہ جائیں گے۔ چندہ کے معاملہ میں پنڈت جی لسانی لفاظی۔ گندم نمائی۔ افترا۔ تملق۔ چشم نمائی۔ تخویف۔ ترغیب ہر آلے سے کام لینا مناسب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ قومی چندہ کے لئے ڈاکہ اور سرقہ تک جائز ہے۔

(۴)

گرمی کا موسم تھا۔ لیلا دھر جی کسی کوہستانی مقام میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ سیر کی سیر ہو جائے گی اور کچھ قومی چندہ بھی وصول ہو جائے گا۔ چندہ کی بدولت انہیں زاد راہ سے گونہ بے فکری تھی۔ اگر ایک ہزار وصول کر کے چار پانسو روپیہ خرچ ہو جائیں تو ہندو سبھا کا کیا نقصان۔ ایسے تو کچھ نہ کچھ مل ہی گئے۔ پنڈت جی نے اب کے سعد الپال جانے کا ارادہ کیا تھا۔ جب سے شدھی کی تحریک جاری ہوئی تھی۔ ان کی مالی حالت بہت کچھ روبہ اصلاح ہو گئی تھی۔ لیکن خادم قوم کے لئے یہ موقع کہاں کہ وہ گوشہ عافیت میں بیٹھ سکے۔ خبر آئی کہ مدراس میں مسلمانوں نے طوفان مچا رکھا ہے۔ ہندوؤں کے خطے کے خطے مشرف بہ اسلام ہوتے جاتے تھے۔ علماء نے بڑے جوش سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اگر جلد ہندو سبھا کی طرف سے انتظام نہ ہوا تو یہ لوگ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ پنڈت جی نے معاً پہاڑ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مدراس جانے کو تیار ہو گئے۔ ہندو سبھا کے سیکرٹری نے جب بچشم تر ان سے گذارش کی اس مہم کو آپ ہی سر کر سکتے ہیں۔ ایسا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔ جسے یہ کام سپرد کیا جا سکے۔ قوم کی حالت زار پر ترس کھائیے۔ تو چوبے جی انکار نہ کر سکے۔ فوراً خدام کی ایک جمعیت فراہم

کی گئی۔ اور قافلہ چوبے جی کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ ہندو سبھا کی جانب سے اُسے ایک رخصتی دعوت دی گئی۔ ایک فیاض رئیس نے پنڈت جی کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی اور ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں آدمی رخصت کرنے آئے۔ سفر میں کیا کیا واقعے پیش آئے۔ اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک اسٹیشن پر اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کئی جگہ تھیلیاں ملیں۔ رتلام کی ریاست نے ایک شامیانہ نذر کیا۔ بڑودہ ریاست نے خدام کے لئے ایک موٹر پیش کیا۔ یہاں تک کہ مدراس پہنچتے پہنچتے خدام کے پاس ایک معقول رقم کے علاوہ ضرورت کے کتنے ہی سامان آ گئے۔ وہاں آبادی سے دُور ایک کھلے میدان میں ہندو سبھا کا شامیانہ نصب ہو گیا۔ قومی جھنڈا لہرانے لگا۔ خدام نے اپنی اپنی وردیاں نکالیں۔ مقامی باثر ہندوؤں نے ضیافت کے سامان مہیا کئے۔ راوٹیاں کھڑی ہو گئیں۔ چاروں طرف ایسی چہل پہل نظر آنے لگی گویا کسی بڑے راجہ کی فرودگاہ ہے۔

(۲)

رات کے آٹھ بجے تھے اچھوتوں کی ایک بستی کے قریب ہندو سبھا کے خدام کا خیمہ گیس کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ جس میں زیادہ تر اچھوتوں کی تعداد تھی۔ ان کے لئے الگ ٹاٹ بچھا دیئے گئے تھے۔ اُونچی ذات کے ہندو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت لیلادھر کی جادو اثر تقریر ہو رہی تھی۔ ہم انہیں رشیوں کی اولاد ہیں جو آسمان کے نیچے آسمان بنا سکتے تھے۔ دفعتہً ایک بوڑھے اچھوت نے اُٹھ کر کہا۔ ہم لوگ بھی انہیں رشیوں کی اولاد ہیں۔

لیلادھر۔ بے شک تم بھی انہیں رشیوں کی سنتان ہو۔ تمہاری رگوں میں انہیں رشیوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ گو آج کا ظالم بے درد۔ کم اندیش۔ تنگدل ہندو سماج تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن تم کسی ہندو سے نیچے نہیں ہو۔ چاہے وہ اپنے کو کتنا ہی اُونچا کیوں نہ سمجھتا ہو۔

بوڑھا۔ تمہاری ہندو سبھا کیوں ہم لوگوں کی خبر نہیں لیتی۔

لیلا دھر۔ ہندو سبھا کا جنم ابھی تھوڑے ہی دنوں سے ہوا ہے۔ اور اس قلیل عرصہ میں اس نے جتنے کام کئے ہیں۔ ان پر اسے جس قدر فخر ہو۔ زیبا ہے۔ ہندو قوم ایک عرصہ دراز کے بعد بیدار ہوئی ہے۔ اور اب وہ زمانہ قریب ہے۔ جب اس ملک میں کوئی ہندو کسی ہندو کو نیچ نہ سمجھ سکے گا۔ جب سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں گے۔ رام نے نشاد کو چھاتی سے لگایا تھا۔ اور شبری کے جوٹھے بیر کھائے تھے۔

بوڑھا۔ جب آپ انہیں مہاتماؤں کی سنتان ہیں تو پھر اونچ نیچ میں کیوں اتنا بھید مانتے ہیں۔

چوبے۔ اس لئے کہ ہم پتت ہیں۔ اگیان میں پڑ کر ان مہاتماؤں کو بھول گئے ہیں۔

بوڑھا۔ اب تو آپ کو ہوش آیا ہے۔ ہمارے ساتھ بھوجن کیجئے گا۔

چوبے۔ میں کسی ہندو کے ہاتھ کا بھوجن کر سکتا ہے۔

بوڑھا۔ میرے لڑکے سے اپنی کنیا کا بواہ کیجئے گا۔

چوبے۔ تم میرے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ جب تک تمہارے جنم کا سنسکار نہ بدل جائے۔ جب تک تم میں وچار بیوہار کا شدھی نہ آجائے۔ اُس وقت تک بواہ کا سمبندھ نہیں ہو سکتا۔

بوڑھا۔ جب آپ خود پتت مانتے ہیں۔ خود اگیان میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو آپ کو ہمارے سنسکاروں کو بُرا کہنے کا کیا حق ہے۔ جائیے ابھی کچھ دنوں اپنی آتما کا سدھار کیجئے۔ آپ کا دل ابھی تک ابھیمان سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ابھی بھید بھاؤ سے مکت نہیں ہوا۔ اب اس دیوتا کی شرن جا رہے ہیں۔ جس کے ماننے والے ہم سے گلے ملنے کو آج تیار ہیں۔ ہم کو اُن سے ملنے کے لئے اپنے سنسکاروں کے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جیسے ہیں۔ اچھے یا بُرے۔ ویسے ہی وہ ہم کو اپنے پاس بُلا رہے ہیں۔ آپ اگر اونچے ہیں۔

تو اونچ نیچ ہندو ہاں ہے۔ ہم میں لڑنے کی طاقت نہیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہ رہیں جن کے ساتھ ہمیں لڑنا نہ پڑے گا۔ آخر ہم میں کیا برائیاں ہیں۔ جن کی وجہ سے آپ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ ہم شراب پیتے ہیں۔ لیکن آپ شرابیوں کی جوتیاں چاٹتے ہیں۔ ہم ماس کھاتے ہیں۔ لیکن آپ گئو کا ماس کھانے والوں کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔ اسی لئے تو وہ آپ کو ٹھوکر جائیں گے ہم بھی آج زبردست ہو جائیں تو آپ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ وہی اونچا ہے جو بلوان ہے۔ وہی نیچا ہے جو نربل ہے۔ یہی آپ کا دھرم ہے۔

یہ کہہ کر بڈھا وہاں سے چلا گیا اور اس کے ساتھ سارے آدمی اٹھ گئے صرف چوبے جی اور ان کے چیلے پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے۔ گویا نعرہ کے بعد اس کی صدائے بازگشت گونج رہی ہو۔

(۵)

تبلیغی جماعت نے جب سے چوبے جی کے آنے کی خبر سنی تھی۔ اس فکر میں تھی کہ کسی حکمت سے اسے یہاں سے دور کرنا چاہیئے۔ چوبے جی کا نام دور دور تک مشہور تھا ان کی سحر کار تقریر کا لوہا سب مانتے تھے۔ اگر ان کے قدم یہاں جم گئے۔ تو پھر تبلیغ کو راہ فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔ پہلے سوچا کہ کوئی مذہبی مباحثہ چھیڑ دیا جائے۔ لیکن یہ خیال خام ہوا کہ ان گستہ ناتراشوں پر مباحثہ کا شاید کوئی اثر نہ ہو۔ آخر یہ رائے طے پائی کہ چوبے جی کی مرمت کی جائے۔ رات کو کچھ لوگ ہندو سبھا کے کیمپ میں جا کر چھپ جائیں۔ جونہی موقع ملا۔ کمین گاہوں سے نکل پڑیں اور اپنا کام کر کے رفو چکر ہو جائیں۔ مذہبی فدائیوں کی وہاں کیا کمی کئی آدمی کمر کس کر تیار ہو گئے۔ عیدو اور وفاتی دونوں ملا کے سرفروش تھے۔ انہیں منہ مانگی مراد ملی۔

رات کے ۲ بجے تھے۔ ہندو کیمپ نیند میں مست تھا۔ لیلا دھر بھنگ کے نشہ میں چور ہندو سبھا کے سکریٹری کو خط لکھ رہے تھے۔ حالت خراب ہے۔ حریفوں نے یہاں اپنا اڈہ جما لیا

ہے۔ یہاں جب تک باقاعدہ کیمپ نہ کھولا جائے گا۔ کامیابی کی کوئی اُمید نہیں۔ فی الفور روپے ارسال فرمایئے۔ اس موقعہ پر اگر سبحانی بخل کیا تو ہمیشہ کے لئے اُسے کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ میری طرف سے اخبارات میں ایک اپیل علیحدہ نکال دیجئے۔ یہاں کامیابی کا راز روپیہ ہے۔ چاروں طرف سے صدا آرہی ہے۔ روپیہ روپیہ۔ عیسائیوں نے روپے سے اپنی دھاک بٹھائی۔ تبلیغ روپے سے عمل تسخیر کر رہا ہے۔ اور ہم تقدیر کا دامن پکڑے بیٹھے ہیں۔ کوری تقریر سے کچھ نہ ہوگا۔ آخر میں کوئی دیوتا تو نہیں جو محض تقریر کے جادو سے کایا پلٹ کر دوں گا۔

اگر وہ لوگ ایک فرخ کریں تو ہمیں دو فرخ کرنے کو تیار رہنا چاہئے کیونکہ ہمارے ہی جسم کے اعضاء پر نشتر چلایا جا رہا ہے۔ آہ ہندو جاتی۔ تیرے برے دن آگئے کہ دشمن چاروں طرف سے تجھ پر حربے چلا رہے ہیں۔ اور تو جمود کی حالت میں پڑی ہوئی ہے

یکایک عیدو اور وفاتی چھرے لئے ہوئے خیمہ میں گھس پڑے۔ پنڈت جی انہیں دیکھتے ہی گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خیمہ سے بھاگنے کی راہ دیکھنے لگے۔ جب مفر نظر نہ آیا تو ہمت یاس سے کام لے کر بولے۔ تم لوگ کون ہو۔ کیا چاہتے ہو۔

عیدو۔ ہم لوگ حضرت میکائیل کے فرشتے ہیں۔ تمہاری رُوح قبض کرنے آئے ہیں۔

یہ کہہ کر دونوں نے چھرے مارنے شروع کئے۔ لیلا دھر لحیم آدمی تھے۔ مشکل سے جنبش کر سکتے تھے۔ تین پاؤ امرتیوں کا ناشتہ کرتے۔ بھوجن کے وقت سوا پاؤ گھی دال میں کھاتے۔ تیسرے پہر بادام اور دودھ ملا کر شربت پیتے۔ جس میں بھنگ کی ہلکی سی چاشنی ہوتی تھی۔ رات کو بالائی پوریاں حلوہ وغیرہ مرغن اشیا کثیر مقدار میں چٹ کر جاتے۔ ایسا آدمی اکھاڑے میں چاہے گھنٹوں چت پڑا رہے۔ یہاں تک کہ حریف عاجز آکر اسے چھوڑ دے۔ لیکن چھرے کے سامنے چستی اور پھرتی کی ضرورت تھی۔ وہ یہاں مفقود تھی۔ قاتلوں نے تابڑ توڑ اتنی چھریاں ماریں کہ بیچارے چلا بھی نہ سکے۔ حالانکہ چلانا بھی اس وقت بے سود تھا۔ آخر زخموں

سے چور ہو کر وہ گر پڑے۔ قاتلوں نے سمجھا کام تمام ہو گیا۔ نو دو گیارہ ہو گئے۔

(۵)

صبح کو گرد و نواح میں شور مچ گیا۔ ہزاروں آدمی واردات پر جمع ہو گئے۔ پنڈت جی کو زخم گہرے لگے تھے۔ مگر ابھی جان باقی تھی۔ لوگوں نے قیاس دوڑانا شروع کیا۔ یہ حرکت کس کی ہے۔ گھنٹوں رائے زنی ہوتی رہی۔ کوئی کہتا ڈاکوؤں کی حرکت ہے۔ کوئی کسی رقیب کو مورد الزام ٹھہراتا۔ لیکن کسی کو نہ سوجھتی تھی۔ کہ زخمی کی مرہم پٹی کی فکر کرے۔ سرکاری شفاخانہ وہاں سے بیس میل پر تھا۔ ادھر حالت اتنی نازک تھی کہ یہ جانے کون سی سانس دم واپیں ہو۔ کیمپ کے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں چھوٹے ہوئے تھے۔ نظریں بچا بچا کر لوگ یکے بعد دیگرے کھسکتے جاتے تھے۔ آج چوبے جی کی باری تھی۔ کل نہ جانے ہم میں سے کس کی شامت آئے۔ کچھ یہاں جان دینے تو آئے نہیں۔ قوم کی خدمت کرنے آئے ہیں۔ اگر خدمت کے معنی جانبازی ہے تو ہم اس خدمت سے درگذرے۔ اگر جان ہی دینی ہے تو فوج میں نہ چلے جائیں گے۔ جہاں ایک دن صوبیدار میجر ہو سکتے ہیں۔ یہاں کیوں پڑے رہیں گے۔ کون کہے کہ سنگھ سبھا ہمارے بال بچوں کے لئے وظیفہ مقرر کر دے گی۔

شام ہوتے ہوتے کیمپ میں سناٹا چھا گیا۔ کیمپ کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہا۔ تماشائیوں کا ہجوم بھی کم ہوا۔ پنڈت جی بچارے خاک و خون میں لیٹے بے ہوش نیم جاں۔ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ ہوش نہ تھا۔ پر درد کا حس باقی نہ تھا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ پہاڑ ٹیلیاں جنگلی جانور سر شام سے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ رات کیسے گزرے گی۔

اچھوتوں کا بوڑھا مکھیا آج کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ نو بجے رات کو گھر واپس آیا تو خبر سنی۔ گھر والوں سے بولا۔ تم نے پنڈت جی کی مرہم پٹی کی فکر بھی نہیں کی۔ ان کا یہاں کوئی دوسرا بیٹھا ہے۔ ان کے ساتھ کے آدمی پردیسی ٹھہرے۔ گھبرا گئے ہوں گے۔ شاید بھاگ بھی گئے ہوں۔ یہ تو تمہارا دھرم تھا۔ کہ زخمی کو گھر لاتے۔ اس کی امداد کرتے۔ ہمارے ہی اپکار کے لئے تو وہ یہاں

آ گئے تھے۔ اگر ہماری فکر نہ ہوتی تو وہ یہ زحمت کیوں اٹھاتے اور زخمی کیوں ہوتے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ تو ہمارے لئے سینکڑوں کوس سے آئیں اور آپ ایسے ایسے ظلم اٹھائیں اور ہم اُن کی خبر تک نہ لیں۔ پرماتما کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اتنا بڑا گاؤں ہے کسی میں بھی اتنی دیا نہ آئی۔ اگر کوئی جانور سا اٹھا لے گیا تو سوکس پر مصیبت پڑے گی۔ پرماتما کے یہاں کون پکڑا جائے گا۔ کس کے منہ میں کالک لگے گی۔

یہ کہتا ہوا وہ اُلٹے پاؤں لوٹا اور ہندو کیمپ کی طرف چلا۔ سارا گاؤں اسکی رضا کا غلام تھا۔ چودھری کا حکم سب کے لئے قانون تھا۔ اس کے جاتے ہی لوگ ڈولی لے کر کیمپ کی طرف چلے۔ چودھری نے پنڈت جی کو بڑی نرمی سے اٹھا کر ڈولی میں لٹایا اور ایک لمحہ میں ڈولی اس کے گھر پہنچ گئی۔ قریب کے گاؤں میں ایک نائی رہتا تھا۔ وہی وہاں کا سرجن تھا۔ وہیں تک لوگوں کی دوڑ تھی۔ اچھے ہوتے تو اس کے ہاتھوں۔ مرتے تو اس کے ہاتھوں۔ راتوں رات اُس کے پاس قاصد دوڑایا گیا اور وہ قریباً آدھی رات کے قریب اس پہاڑی راستے اور اندھیری رات میں گرتا پڑتا چودھری کے گھر آ پہنچا۔ دیکھئے یہ جہلا کی تہذیب کا نمونہ ایک سرجن رات کو باہر نہیں نکلتا۔ نکلتا ہے تو دگنی تگنی فیس لے کر۔ اگر سواری نہ ہو تو قدم نہ اٹھائے۔ وہاں آدھی رات کو غریب خبر پاتے ہی دوڑا چلا آتا ہے۔ کسی صلہ کی تمنا میں اگر کچھ مل جائے تو واہ وا۔ ورنہ کسی سے شکایت نہیں۔ سانپ کا منتر جاننے والا اگر کسی حادثہ کی خبر پا کر دوڑ نہ پڑے تو اسے پاپ لگتا ہے۔ مینہ کی جھڑی ہو۔ رات اندھیری ہو۔ کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا دھرم ہے کہ مارگزیدہ کے پاس آئے۔ اور حتی الامکان اسکی خدمت کرے نائی نے زخمی کو دیکھا۔ اس کے زخموں کو دھویا۔ مرہم رکھا۔ پٹی باندھی اور وہیں لیٹ رہا۔ تین دن تک وہ پنڈت کے سرہانے سے نہ ٹلا۔ یہاں تک کہ پنڈت جی نے آنکھیں کھولیں۔

(۶)

مہینے بھر تک پنڈت جی چارپائی پہ پڑے رہے۔ زخم روز بروز بھرتے جاتے تھے۔ جسم میں

قوت عود کرتی جاتی تھی۔ لیکن نائی کی سخت تاکید تھی کہ یہ اٹھنے نہ پائیں۔ سارا گھر ان کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ گھر ہی نہیں گاؤں بھر کے مرد عورتیں ان کی خدمت کرتے۔ خود چاہے فاقے کر جائیں لیکن پنڈت جی کے لئے مقوی غذا بہم پہنچاتے۔ ایک آدمی سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا پنکھا جھلتا رہتا۔ انہیں پہلو سے کروٹ بدلاتا۔ اٹھاتا۔ حوائج کے لئے چارپائی سے نیچے اتارتا ایک مستقل تیماردار کے بغیر ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ وہ لوگ یہ ساری خدمت خندہ پیشانی سے کرتے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ کہاں کی بلا گلے پڑی۔ چوبے جی زود رنج ہو گئے تھے۔ بیماری میں انسان کچھ چڑچڑا ہو ہی جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتے اور گھر والوں کو ڈانٹ بیٹھتے۔ پر کوئی برا نہ مانتا۔ خاص کر اس لئے کہ ذرا سی دیر میں پنڈت جی چشم پرنم معذرت کرنے لگتے۔ ان کا ضمیر کہتا۔ تم ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ یہ بیچارے مصروف رہتے ہیں۔ انہیں اتنی فرصت کہاں کہ کسی کی تیمارداری کریں۔ تمہارے ساتھ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ کیا کم ہے کہ تم اس سے زیادہ کی امید رکھتے ہو۔ دہقانوں کے اس ایثار کے مقابلہ میں پنڈت جی کو اپنی دنیا پرستی پر شرم آتی ہے۔ وہ سوچتے اگر میرے کوئی باہر کا آدمی یوں آکر پڑ جاتا تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ شاید قریب کھڑا بھی نہ ہوتا۔ وہ بیچارا کراہ کراہ کر مر جاتا۔ میری تیمارداری معالجہ اور خوراک میں ان غریبوں کے سینکڑوں روپے صرف ہو گئے۔ یہ کتنے بے غرض کتنے فراخدل کتنے پاک نفس لوگ ہیں۔ اور میں انہیں شدھ کرنے چلا تھا۔ انہیں انسانیت کا سبق دینے چلا تھا۔ میں انہیں جاہل غیر مہذب سمجھتا تھا۔ ہم عالموں سے جاہل ہی اچھے ہم تہذیب یافتوں سے یہ غیر مہذب لوگ ہزار درجہ بہتر۔ ہم اچھوتوں سے بھی نیچے بدرجہا قابل عبرت۔ اگر تہذیب علم اور شرافت کے معنی دنیا پروری۔ تنگدلی اور غرور ہے تو اس علم اور اس تہذیب کو سلام۔ ان خیالات نے پنڈت جی کے باطن پر عمل کرنا شروع کیا۔ ان کی خود شدھی ہونے لگی۔ منتروں سے نہیں۔ اگنی کنڈ کے سامنے نہیں۔ گوبر کھلا کر نہیں۔ بلکہ وہ سچی شدھی وہ معنوی تالیف جو حق و باطل کی تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے عقائد نے انکسار کے

سامنے سر جھکا دیا۔ خود غرضی نے ایثار کے سامنے بوسہ دیا۔ انہیں معلوم ہوا۔ یہ دیوتا لوگ ہیں۔ اور مجھے پرماتما نے اصلاح باطن کے لئے ان کے بیچ میں ڈال رکھا ہے۔

رفتہ رفتہ پنڈت جی میں چلنے پھرنے کی طاقت آگئی۔ اب وہ ان احسانات عظیم کے اظہار شکریہ کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ ایشور کی کچھ مرضی۔ اسی زمانہ میں اس علاقہ میں پلیگ کا دورہ ہوا۔ اچھوتوں میں یہ وہم پھیلا ہوا تھا کہ یہ کوئی شیطانی بلا ہے۔ اور جو آدمی کسی طاعون زدہ کی امداد کریگا۔ وہ اور اس کا خاندان اس شیطان کے قہر کا شکار ہوگا۔ توہمات کے زیر اثر انسان سے حیوانی حرکات سرزد ہوا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ آدمیوں کا بلیدان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ طاعون کا دورہ ہوتے ہی کئی آدمی بیمار ہوگئے۔ اور سارے گاؤں کے لوگ انہیں ان کی قسمت پر چھوڑ کر گاؤں کے باہر نکل گئے۔ کوئی ان غریبوں کے نزدیک نہ جاتا۔ ان کی تیمارداری تو درکنار شیطان کے پنجہ میں پھنسا ہوا انسان شیطان سے کم خوف انگیز نہ تھا۔ بوڑھے چودھری بھی شیطان کی زد میں آگئے۔

صبح کا وقت تھا۔ گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دو تین گھروں کے دروازے کھلے تھے۔ مگر انسان کا وجود نہ تھا۔ چوبے جی گاؤں میں داخل ہوئے۔ انہیں بھی گاؤں والے اپنے ساتھ زبردستی کھینچ لے گئے تھے۔ اس وقت بھی آدمی ان کے ساتھ گاؤں کے ڈانڈے تک منع کرتے ہوئے آئے۔ انہیں خوف تھا کہ گاؤں میں جا کر پنڈت جی سلامت نہ لوٹیں گے لیکن پنڈت جی نے انہیں تشفی دی۔ اور انہیں رخصت کر کے گاؤں میں آئے۔ ان کا دل بھی ایک نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا مگر انہوں نے دل کو مضبوط کیا اور چودھری کے مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو بوڑھا چودھری آنکھیں بند کئے توکل کی تصویر بنا ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑا ہوا ہے۔ ان کی آہٹ پاتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سُرخ تھیں۔

چوبے جی نے پوچھا۔ چودھری کیسی طبیعت ہے۔

چودھری:۔ اچھا ہوں۔ تم جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔ کیا گاؤں والوں نے تم کو نہیں بتلایا۔

کچھ نہیں بتلایا۔ کچھ نہیں بتلایا۔ کیسے بے سمجھ ہیں۔ کیسے نردئی ہیں۔ جاؤ مجھے مرنے دو۔
چوبے۔ گھبراؤ مت۔ مجھے بہت سے منتر یاد ہیں۔ بھوت پریت میرا کچھ نہیں کر سکتے۔
چودھری۔ ارے بابا! کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ یہاں سے جاؤ۔ نہیں نہیں مجھے مت چھوؤ نا۔ مگر چوبے جی نے نہ مانا چودھری کے پاس بیٹھ کر انہوں نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا تو سارا بدن توے کی طرح جل رہا تھا۔ بغل میں ایک گلٹی نکل آئی تھی مگر پلیگ خوفناک قسم کا تھا۔ چوبے جی نے فوراً آگ جلائی اور گلٹی کو پتھر سے سینکنا شروع کیا چودھری لیٹے لیٹے ان کی طرف مرعوب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کوئی دیوتا ہے۔ اب تک شیطان نے اس پر حملہ نہیں کیا چوبے جی نے آدھ گھنٹے تک گلٹی کو سینکا اور تب دوسرے مریضوں کے یہاں پہنچے وہاں بھی یہی کیفیت تھی ایک تو بالکل بے ہوش تھا مگر دو ہوش میں تھے انہوں نے بھی چوبے جی کو بھگانا چاہا مگر چوبے جی نے ان کی تشفی کی یہاں تک کہ وہ بھی خاموش ہو گئے

اگرچہ سرکاری شفاخانہ وہاں سے دس کوس پر تھا اور راستہ نہایت خراب اس پر پنڈت جی ابھی تک کمزور تھے پر انہوں نے گلٹیوں کو کپڑے سے باندھ کر شفاخانے سے دوا لانے کی ٹھانی۔ سوچا اگر مر بھی گئے تو کیا غم۔ انہیں لوگوں نے تو مجھے دوبارہ زندگی عطا کی۔ ورنہ اب تک جنگلی جانوروں کے پیٹ میں ہضم ہو گیا ہوتا۔ بھاگا بھاگ چلے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں کسی کا ٹٹو چرتا ہوا مل گیا۔ راس بھی پڑی ہوئی تھی آپ جھٹ اس پر سوار ہو گئے۔ دل کو سمجھایا ٹٹو میں کہیں لئے تو جاتا نہیں۔ لوٹ کر یہیں چھوڑ دوں گا۔ مالک صاحب بہت گرم پڑینگے تو ایک روپیہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ ٹٹو تھا سبک خرام تیسرے پہر منزل مقصود پر جا پہنچا۔ چوبے جی سرجن سے ملے۔ گاؤں کی ساری کیفیت بیان کی اور مرہم اور ادویات کا بکس لئے ہوئے پھر لوٹے۔ ٹٹو کو راستہ میں چھوڑ دیا۔ آٹھ بجتے بجتے گاؤں میں آ پہنچے اور اسی وقت مریضوں کو دوا پلادی۔ پہلے تو کوئی مریض دوا پینے پر راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں بھوت مہاشے بگڑ جائیں کہ یہ میرے پنجے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور غصہ

میں آ کر میرے بال بچوں کو ستائیں۔ لیکن پنڈت جی نے دلاسا دے دے کر دوائیں پلا دیں پھر مرہم بھی رکھ دیا۔

آج پنڈت جی میں اتنی قوت نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی دن بھر دوڑے بیس کوس کی منزل طے کی مگر نہ ماندگی اور تکان کا غلبہ نہ نیند کا۔ ساری رات مریضوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ کبھی اس گھر میں جاتے کبھی اُس گھر میں۔ باری باری تینوں مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔

پانچ دن تک یہی کیفیت رہی۔ چوبے جی نے ملکوتی ایثار سے کام لیا۔ کھانے پینے کی چیزیں برتن وغیرہ تو گھروں میں موجود تھے۔ پر وُہ ایک بار بمشکل تمام کچھ بنا کر بھوگ لگا لیتے تھے۔ باقی سارا دن اور ساری رات مریضوں کے علاج معالجہ اور عیادت میں صرف کرتے۔ مریضوں کو بچنا تھا۔ بچ گئے۔ مگر اس کا جس پنڈت جی کو ہُوا۔

(۷)

اس جانبازانہ عیادت نے لوگوں کو چوبے جی کا معتقد بنا دیا۔ جنہیں لوگوں نے مایوس العلاج سمجھ لیا تھا وُہ چنگے ہو گئے۔ جن کی ساری زندگی کی اُمیدیں منقطع ہو گئی تھیں وُہ زندہ تھے۔ پنڈت جی نے انہیں شیطان کے پنجۂ بے درد سے نجات دلائی تھی۔ یہ عام خیال تھا کہ پنڈت جی کی بھوتوں سے خونریز جنگ ہوئی اور پنڈت جی ان پر غالب آئے مگر وہ جان پر کھیل کر ان آدمیوں کی حمایت نہ کرتے تو ان کا بچنا محال تھا۔ یہ آدمی نہیں کوئی دیوتا ہیں۔ ضرور دیوتا ہیں۔ دیوتاؤں کے سوا اور کون غریب ستم زدوں کی حمایت کرتا ہے کون بیکسوں کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ بھوتوں کی فوج آئی ہو گی ایک سے ایک ہیبت اور کریہہ منظر دیو سامنے آئے ہوں گے۔ مگر اس شیر نے سبھوں کو نیچا دکھایا۔

ایک آدمی بولا۔ کسی دیوتا کا اوتار ہے۔

بوڑھے چودھری نے کہا۔ دیوتا کا اوتار نہیں تمہارا سر دھرماتما آدمی ہیں اور

دھرماتما آدمی دیوتاؤں سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ رات کی رات جاگتے رہتے تھے۔ پلک تک نہیں جھپکتی تھی۔ کبھی میرے پاس بیٹھتے تھے کبھی بھیکو کے پاس جاتے۔ کبھی چھرو کے گھر۔ نہ کھانے کی فکر رہتی تھی نہ پینے کی۔ دوا پلاتا۔ دودھ گرم پانی دیتا۔ میں تو ایمان کی کہتا ہوں اپنا بیٹا بھی ہوتا اس طرح سے خدمت نہ کرتا۔

بھیکو۔ میں تو کبھی کبھی غصہ میں آکر گالیاں دینے لگتا تھا لیکن کیا مجال کہ ذرا بھی من میلا ہو۔ ایسا دھرماتما تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میری تو اگر وہ جان بھی مانگیں تو دونوں ہاتھوں سے دے دوں۔

چودھری۔ میں نے تو طے کر لیا ہے کہ اب ان کا چیلا ہو جاؤں گا۔ پرانے زمانے میں ایسے ہی رشی مہاتما ہوتے ہوں گے۔ ایسے مہاتماؤں کی شرن چھوڑ کر اور کہاں جاؤں۔ مولوی لوگ بھی باتیں بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں اونچ نیچ بھید بھاؤ نہیں لیکن ان لوگوں کے دل صاف نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا ایسے مہاتما پر چھپ کر وار کرتے ہیں۔ ہم لوگ بھوتوں کے پھندے میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے کوئی پاس نہ پھٹکا۔ جس دھرم میں سچے مہاتما نہیں وہ دھرم کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ تم لوگوں کی مرضی جیسی ہو وہ کرو۔ لیکن میں تو اپنا دھرم نہ چھوڑوں گا۔ پہلے میں سمجھتا تھا ہمارا دھرم مردہ ہو گیا ہے۔ جبھی تو یہ خرابیاں آگئی ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہمارا دھرم جیتا جاگتا ہے۔ اس میں اب بھی دکھیوں کا دکھ ہرنے والے رشی مہاتما پیدا ہوتے ہیں۔

بھیکو۔ چودھری تم نے میرے من کی بات کہہ دی۔ میں بھی سوچ رہا تھا ایسے مہاتما کو چھوڑ کر اب ہم اور کسی کی بھگتی نہ کریں گے۔

چھرو۔ اب مولوی لوگ آئیں گے تو دور ہی سے سلام کروں گا۔ ہم کسی سے نیچے نہیں ہیں۔ ایسے ایسے مہاتما جن کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہ کریں وہ نیچے نہیں ہو سکتے۔

بڑی دیر تک لوگوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے دن سارے گاؤں نے پنڈت جی

کو اپنا گورو بنایا اور سارے علاقہ میں ان کی پاک نفسی کا شہرہ ہو گیا۔ جوق کے جوق ان کے درشنوں کو آنے لگے۔ پنڈو دھرم کے اُکھڑے ہوئے قدم بہ صدائے اُمید سُنتے ہی سنبھل گئے اور چوبے جی کو تالیف کا ایک ایسا منتر ہاتھ آ گیا۔ جو کبھی چُوک ہی نہ سکتا تھا جس سے چاروں پدارتھ آٹھوں سدھیاں اور ساری ودھیاں مل جاتی ہیں۔

کپتان

(۱)

جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی۔ وُہ سیلانی آوارہ گرد گھمکڑ نوجوان تھا کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ہاتھ شوق سے گالیاں کھاتا کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھ کر پار نکل جاتا۔ گالیوں میں مزہ آتا تھا اُسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا تھا۔ آوارگی اور مسرفی دونوں ہمزاد ہیں اور مسرفی کا سرقہ سے گاڑھا رشتہ ہے۔ جگت سنگھ کو جب موقعہ ملتا۔ گھر سے روپیہ اُڑا لے جاتا۔ نقد نہ ملے تو برتن نکال لے جانے میں اسے دریغ نہ تھا۔ گھر میں جتنی شیشیاں اور بوتلیں تھیں۔ وُہ سب اُس نے صاف کر دیں۔ پُرانے وقتوں کی کتنی ہی چیزیں ان کے یہاں پڑی تھیں۔ جگت سنگھ نے ایک ایک کر کے اُن کا خاتمہ کر دیا۔ اس فن میں ایسا شاطر اور ہوشیار تھا کہ اس کی جدت اور مشکل پسندی پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار وُہ اپنے دو منزلہ مکان کی چھت پر باہر ہی باہر سے چڑھ گیا اور اُوپر ہی سے ایک پیتل کا تھالی لے کر اُتر آیا۔ گھر والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔

اس کے باپ ٹھاکر بھگت سنگھ اپنے محلہ کے ڈاکخانہ کے منشی تھے۔ بڑی کوشش اور منتوں کے بعد افسران نے انہیں وطن کا ڈاک خانہ دیا تھا۔ لیکن بھگت سنگھ جن ارادوں سے گھر آئے تھے۔ وُہ ایک بھی پُورا نہ ہوا۔ اُلٹا نقصان یہ ہُوا کہ آمدنی کی وُہ صورتیں جن سے مفصلات میں وُہ مستفید ہوتے تھے یہاں مسدود ہو گئیں۔ یہاں سب سے پُرانے تعلقات اور رشتے تھے۔ جبر یا بے مروتی کا موقعہ نہ تھا۔ اس خشکی میں جگت سنگھ کی دست درازیاں

حد درجہ شاق گذرتیں۔ اُنھوں نے اسے بارہا بڑی بے دردی سے پیٹا۔ جگت سنگھ قوی الجثہ ہونے پر بھی چپکے سے مار کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن مار پیٹ۔ تنبیہ۔ فہمائش کا اس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔

جُوں ہی وُہ گھر میں قدم رکھتا چاروں طرف سے کانوں کانوں بج جاتی۔ ماں دُور دُور کرکے دوڑتی۔ دونوں بہنیں گالیاں دینے لگتیں۔ بیچارہ اُلٹے پاؤں بھاگتا۔ کبھی کبھی وُہ دو دو تین تین دن بھوکا رہ جاتا۔ گھر والے اس کی صورت سے جلتے تھے۔ آوارہ گردی نے اُسے ڈھیلیوں کا خُوگر بنا دیا تھا۔ جہاں نیند آ جاتی۔ وہیں پڑ رہتا۔ جو کچھ مل جاتا وُہی کھا لیتا۔

جُوں جُوں گھر والوں کو اس کی حرکتیں معلوم ہوتی جاتی تھیں وُہ چوکنے ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک بار کامل مہینہ بھر تک جگت سنگھ کی دال نہ گلی۔ چرس والے کے کئی روپے چڑھ گئے۔ گانجہ والوں نے تقاضوں کے مارے ناک میں دم کر دیا۔ حلوائی راہ چلتے کڑوی باتیں سُنانے لگا۔ بیچارے کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ رات دن تاک جھانک میں رہتا۔ لیکن گھات نہ ملتی۔ آخر ایک دن بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بھگت سنگھ ڈاکخانہ سے دوپہر کو چلے تو احتیاطاً ایک بیمہ کی رجسٹری جیب میں ڈال لی۔ لیکن گھر پہنچ کر اچکن اُتارتے وقت اس کا خیال نہ رہا۔ دالان میں اچکن اُتار کر رکھ دی۔ جگت سنگھ تو گھات لگائے ہوئے تھا ہی۔ پیسوں کی اُمید میں اُن کی جیب ٹٹولی۔ لفافہ مل گیا۔ اس پر کئی آنے کے ٹکٹ تھے۔ ٹکٹوں کے لالچ میں اُس نے لفافہ اُڑا لیا۔ کئی بار وُہ ٹکٹ چُرا کر آدھے داموں پر بیچ دیتا۔ جب لفافے پر ٹکٹ آسانی سے نہ اکھڑ سکے تو اس نے لفافہ پھاڑ ڈالا۔ اس میں سے ایک سَو روپیہ کا نوٹ نکل پڑا۔

جگت سنگھ کی باچھیں کھِل گئیں۔ بمبئی کی سیر کی اُسے بہت خواہش تھی اُسی دن چپکے سے بمبئی چل دیا۔ گھر پر کسی سے کچھ نہ کہا۔ دوسرے ہی دن منشی بھگت سنگھ پر سرقہ اور غبن کا مقدمہ دائر ہو گیا۔

بمبئی میں قلعہ کے میدان میں بینڈ بج رہا تھا۔ اور راجپوت رجمنٹ کے سجیلے اور خوشرو جوان قواعد کر رہے تھے۔ جس طرح ہوا بادلوں کو نئے روپ میں بدلتی اور بگاڑتی ہے۔ اُسی طرح افسر گھوڑے پر سوار زبان کے اشارے سے سپاہیوں کو نئی نئی ترتیب سے آراستہ کرتا اور بگاڑ دیتا تھا۔

جب قواعد ختم ہوگئی تو ایک چھریرے بدن کا جوان اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

کیا نام ہے؟

جگت سنگھ

کیا چاہتے ہو؟

فوج میں بھرتی کر لیجئے۔

عدن جانا پڑے گا؟

خوشی سے جاؤں گا۔

بہت محنت کا کام ہے؟

اس کا ڈر نہیں۔

مرنے سے تو نہیں ڈرتے؟

بالکل نہیں۔ راجپوت ہوں

جگت سنگھ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس میں جرأت اور حوصلہ کی کمی نہ تھی۔ پانی کی طرح بہاؤ کا راستہ نہ پاکر اس کا طبعی کجروی کی جانب مائل ہوتا تھا۔ لیکن یہاں اُسے اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقعہ ملا۔ خلقی جوہر کھلنے لگا۔

تین دن بعد یہ رجمنٹ عدن چلی۔ اس وقت جگت سنگھ کو گھر کی یاد آئی۔ ماں کے نام ایک خط لکھا۔ ہم عدن جاتے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

عدن میں پہنچکر کتنے سپاہی بے دل ہوگئے۔ لیکن جگت سنگھ کے چہرے پر ذرا بھی میل

نہ آیا۔ اس کی جفاکشی اور بے خوف جرأت پر افسروں کو حیرت ہوتی تھی۔ مشکلات کے ساتھ اس کی ہمت بھی بڑھتی تھی۔ نقلی لڑائیوں میں وہ سب سے پیش پیش رہتا۔ جس مہم میں سب کی ہمتیں جواب دے جاتیں۔ اسے سر کرنا اسی کا کام تھا۔ دھارے میں جس طرح اس کا مردانہ جوش چمک اٹھتا تھا اسی طرح ہمت میں اس کا مردانہ استقلال محال کو آسان کر دیتا تھا۔ اس کے افسر کہتے۔ یہ ہوشیار نوجوان ہے کبھی نام کرے گا۔

جگت سنگھ کو عدن میں چار سال گزر گئے۔ اس کے چہرے سے اب ایک شکوہ اور رعب ٹپکتا ہے۔ وہ اب ایک جسیم نوجوان ہے۔ اس کے جسم کے تناسب پر کسی جمناسٹ کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ اس کے انداز گفتگو سے ایک شان اہمیت ٹپکتی ہے۔ اس کے افسران کو اس پر کامل اعتبار ہے۔ اب وہ پہلے کا بے فکر آوارہ لڑکا نہیں ہے۔ ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ اسے اب گھر کی فکر پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کبھی سوچتا ہے نہیں معلوم گھر کا کیا حال ہوگا۔ اس کے صرف سے جو کچھ بچتا ہے وہ سب گھر بھیجتا ہے۔ لیکن گھر سے کبھی اس کے خطوں کا جواب نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں اماں جیتی ہیں یا نہیں۔ اسے بار بار ماں بہنوں کی یاد آتی ہے۔ ان کی سخت کلامیاں اسے بالکل بھول گئی ہیں۔ کبھی کبھی بیتابی کے عالم میں اس کا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر پہنچ جاؤں۔ جب کبھی باپ کی یاد آتی ہے۔ تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ آہ! میری بدولت مجھ بدنصیب ننگ خاندان کی بدولت آج وہ قید میں ہیں۔ اسے اپنی نادانی اور جہالت پر افسوس آتا ہے۔

ایک روز اس نے جا کر کپتان سے کہا صاحب مجھے چھٹی دیجئے۔ گھر جانا چاہتا ہوں کپتان ڈاک دیکھ رہا تھا۔ اسے دکھا کر بولا۔ بہت ضروری کام ہے لڑائی چھڑ گئی ہے۔

جگت سنگھ۔ یہ کب سے مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔

کپتان۔ آج ہی خبر آئی ہے۔

جگت سنگھ۔ تب میں گھر نہیں جاؤں گا۔

کپتان - نہیں نہیں - اگر جانا ضروری سمجھو تو چھٹی مل سکتی ہے۔ (مسکرا کر) ابھی ہم لوگوں کو لام پر جانے میں دیر ہے۔ ہندوستان سے فوجیں پہنچ گئی ہیں۔

جگت سنگھ - جی نہیں - اب نہ جاؤں گا۔

کپتان نے دوسرا لفافہ کھولا اور خوشی سے اچھل کر بولا۔ تمہارا ترقی ہو گیا ہے۔ حوالدار ہو گیا۔ جگت سنگھ نے جھک کر سلام کیا۔

(۳)

سات برس بیت گئے - شام کا وقت ہے کلکتہ میں ٹھاکر بھگت سنگھ سنٹرل جیل میں سر جھکائے اداس بیٹھے ہیں۔ ان کی کمر جھک کر کمان ہو گئی ہے۔ چہرہ زرد ہے جسم لاغر و نحیف۔ سات برس کی قید سخت نے بالکل نڈھال اور خستہ حال کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ بدن میں جان ہی نہیں۔ آج میعاد ختم ہو گئی ہے۔ کل ان کی رہائی کا دن ہے۔ کل وہ آزاد ہو جائیں گے۔ کتنے ہی دیگر قیدیوں کی بھی میعاد پوری ہو گئی ہے۔ ان کے ورثا انہیں لے جانے کے لئے دور دور سے آئے ہیں۔ یہ قیدی مارے خوشی کے ادھر ادھر ٹہلتے پھرتے ہیں لیکن بھگت سنگھ کے چہرہ پر وہی افسردگی کا گاڑھا رنگ ہے۔ تکلیفوں نے خوش ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھی۔

ان ایام قید میں متواتر ان پر مصیبتیں نازل ہوئیں - بیوی مری - دونوں لڑکیاں گئیں - گھر تباہ ہو گیا - اب گھر کہاں ہے۔ جسے دیکھنے کی خوشی ہو - اس خانۂ ویران سے تو جیل خانہ ہی اچھا تھا۔ ہائے کیسی دردناک بے نوائی ہے۔

ایک بوڑھے لیکن توانا قیدی نے آ کر اس کا شانہ ہلایا اور بولا کہو بھگت سنگھ کوئی گھر سے آیا۔

بھگت سنگھ نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ گھر پر ہے ہی کون - سب تو مر گئے - ایک لڑکا تھا - وہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

دوسرا قیدی بولا۔ بھگت سنگھ چلو۔ ادھر سے جگناتھ ہوتے چلیں۔

بھگت سنگھ نے کہا۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے بھائی۔ مجھے تو اب تک یہی نہیں معلوم کہ جاؤں گا کہاں۔

آج قیدیوں کی شب عید تھی۔ محافظِ جیل نے انہیں آزاد کر دیا تھا۔ وہ چاروں طرف خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے۔ کوئی گاتا تھا۔ کوئی بغلیں بجاتا تھا۔ کوئی بیوی کے ملنے کے لئے بیتاب تھا کوئی لڑکوں کو دیکھنے کے لئے بے قرار۔ سب اپنے اپنے منصوبے باندھ رہے تھے۔ سب کے سر پر ایک مسرت آمیز اضطراب کا جنون سوار تھا۔ آپس میں دھول دھپا بھی ہو جاتا تھا۔ آج ایام مصیبت کا خاتمہ ہے۔ کل اس کال کوٹھڑی سے نکل جائیں گے آتشِ شوق دہک رہی تھی۔ لیکن بھگت سنگھ زمین پر پڑے اپنی تقدیر کو رو رہے تھے اپنی حرماں نصیبی کا انہیں آج تک ایسا جاں گسل صدمہ نہ ہوا تھا۔ گھر کی تباہی کانوں سے تو سُن لی۔ لیکن آنکھوں سے کیونکر دیکھا جائے گا۔ کسی کی موت کی خبر سننے اور اُسے جانکنی کی حالت میں دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ہائے اب کوئی نام کو رونے والا بھی باقی نہیں۔ کیا کرنے گھر جاؤں یہیں کہیں ڈوب مروں۔ قصہ تمام ہو جائے۔

رات کو وہ لیٹے تو جگت سنگھ کی یاد آئی۔ سات سال تک کبھی انہوں نے اس کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے دل سے نکال دیا تھا۔ جس کی بدولت زندگی خوار ہوئی عزت آبرو مٹ گئی۔ گھر تباہ ہو گیا۔ اس کا خیال بھی ناقابل برداشت تھا۔ لیکن آج مایوسی اور رنج کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے ہوئے انہوں نے اسی تنکے کا سہارا لیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سوچا معلوم نہیں اس بیچارے پر کیا گذری ملا کو بھاہے لیکن ہے تو اپنا لڑکا ہی۔ خاندان کی نشانی تو ہے۔ مروں گا۔ تو چار آنسو تو بہائے گا۔ گھر پر ہوتا تو چل کر اس کی شادی کر دیتا۔ انہیں میں میری عمر بھی کٹ جاتی۔ نہیں تو اب کون پوچھے گا کہ مرے ہو۔ یا جیتے ہو۔ میں اس کے ساتھ کبھی محبت سے نہیں پیش آتا تھا۔ ذرا بھی

شرارت کرتا۔ تو اس کی گردن پر سوار ہو جاتا۔ ایک بار رسوئی میں محض بلا پیر دھوئے چلے جانے پر میں نے اُسے اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ کئی بار محض زردے سے بدتمیزی کرنے پر میں نے اُسے طمانچے لگائے۔ قیمتی لعل پاکر میں نے اس کی قدر نہ کی۔ یہ اُسی کی سزا ہے۔

(دلی)

صبح ہوئی۔ اُمید کا آفتاب نکلا۔ آج اس کی شعاعیں کتنی مدھم تھیں۔ آسمان کتنا خوشنما۔ ہوا کتنی خوشگوار۔ چڑیوں کی بولیاں کتنی پیاری۔ درخت کتنے سرسبز۔ سارا منظر اُمید کے دلفریب رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

جیل کا افسر آیا۔ قیدی قطار باندھ کر کھڑے ہوئے۔ محافظ ایک ایک کا نام لے کر رہائی کا پروانہ دینے لگا۔ قیدیوں کے چہرے مسرت اُمید سے روشن تھے۔ جس کا نام آتا وہ خوش خوش محافظ کے پاس جاتا۔ پروانہ لیتا۔ اُسے جھک کر سلام کرتا۔ اور تب ولولۂ شادمانی سے مخمور ہو کر اپنے ایام مصیبت کے رفیقوں سے بغلگیر ہو جاتا۔ جونہی وہ دروازہ جیل سے باہر نکلتا۔ اس کے ورثا دوڑ کر اُس سے لپٹ جاتے۔ اشک مسرت کا سیلاب آ جاتا۔ کہیں کوئی پیسے لٹا رہا تھا۔ کہیں مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ کہیں جیل کے ملازموں کو انعام دیا جا رہا تھا۔ آج یہ دوزخ کے دیو اخلاق اور انسانیت کے فرشتے بنے ہوئے تھے۔

آخیر میں بھگت سنگھ کا نام آیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ جیلر کے پاس گئے اور لاپروائی سے آزادی کا پروانہ لے کر دھیرے دھیرے دروازہ جیل کی طرف چلے گویا سامنے کوئی سمندر حائل ہے۔ دروازہ سے باہر نکل کر وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ کہاں جائیں

دفعتاً اُنہوں نے ایک فوجی افسر کو گھوڑے پر سوار جیل کی طرف آتے دیکھا اس کے جسم پر خاکی وردی تھی۔ سر پر کارچوبی خوشنما صافہ۔ ایک عجیب شان سے گھوڑے

پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک فٹن آرہی تھی۔ جیل کے سپاہیوں نے افسر کو دیکھتے ہی بندوقیں سنبھالیں اور باقاعدہ کھڑے ہو کر سلام کیا۔

بھگت سنگھ نے اپنے دل میں کہا۔ ایک وُہ خوش نصیب ہیں۔ جن کے لئے فٹن آرہی ہے۔ ایک میں بدنصیب ہوں۔ جس کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔

نوجوان نے اِدھر اُدھر تلاش کی نگاہوں سے دیکھا اور تب گھوڑے سے اُتر کر سیدھے بھگت سنگھ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ بھگت سنگھ نے اسے غور سے دیکھا اور تب چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ارے جگت سنگھ۔

جگت سنگھ روتا ہُوا اُن کے پیروں پر گر پڑا۔

بھگت سنگھ ایک لحظہ تک خاموش کھڑے رہے۔ جذبات احساس پر غالب آگئے یکایک اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چہرہ پر سُرخی کی جھلک نظر آئی وُہ جھکے اور بیٹے کو اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور تب ایک پُرغرور نگاہ سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف تاکتے ہوئے بولے۔ نارائن تم نے مجھ پر بڑی دیا کی۔

دوسرے قیدیوں نے دونوں آدمیوں کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ کئی اشخاص بھگت سنگھ کو مبارکباد دینے آئے۔ لیکن وُہ اس وقت دوسری ہی دُنیا میں تھے۔ کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔

ذرا دیر میں دونوں آدمی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے۔ فٹن پر بھگت سنگھ تھے گھوڑے پر جگت سنگھ۔ راستے میں انہیں لوگ دیکھ کر کہتے تھے۔ یہی کپتان جگت سنگھ ہیں۔ جنہوں نے جرمنوں کے میگزین میں آگ لگائی تھی۔

تماشائیوں میں ایک سپاہی بھی تھا۔ بولا تم لوگ میگزین ہی کے لئے رہو۔ بغداد کے قلعہ پر سب سے پہلے یہی جھنڈا لے کر چڑھے تھے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا۔ ایسا شور

آج ملک میں نہیں ہے ۔

تیسرا آدمی بولا ۔ ابھی عمر کچھ بھی نہیں ہے ۔ لیکن کیسے کیسے کام کر دکھائے ۔

یہ باتیں سُن کر بھگت سنگھ کے سینے میں گدگدی ہو رہی تھی ۔ آنکھوں میں غرور کا ن
جھلک رہا تھا ۔

تیسرے دن بھگت سنگھ اپنے باپ کے ساتھ گھر پہنچے ۔ گھر مسمار ہو گیا تھا دیواریں زمین سے مل گئی تھیں ۔ دونوں آدمی یہ حال زار دیکھ کر خوب روئے ۔

محلہ میں ہل چل مچ گئی ۔ دم کے دم میں ہمدردوں اور شناساؤں کا ہجوم لگ گیا لوگ تعزیت آمیز مبارکباد دے رہے تھے ۔

ٹھاکر دلیپ سنگھ نے بھگت سنگھ سے کہا ۔ بھیا تمہارے اوپر جو مصیبتیں پڑیں وہ کسی دشمن پر بھی نہ پڑیں ۔ لیکن نارائن نے تمہاری سُن لی ۔

بھگت سنگھ بولے ۔ ہاں بھائی ۔ نارائن نے سچ مچ سُن لی ۔ مجھے اب اس کا ذرا بھی رنج نہیں ہے ۔ گھر کے آدمیوں کے مرنے کا افسوس ہے ۔ لیکن ایشور کی نگاہ رہے گی تو یہ گھر پھر آباد ہو جائے گا ۔

ایک پٹی دار نے طنزیہ لہجہ میں کہا ۔ تم جیل خانہ کیا گئے ۔ تمہاری تقدیر جاگ گئی ۔

بھگت سنگھ نے جواب دیا ۔ ہاں بھائی سچ مچ جاگ گئی ۔ یہ مبارک دن دیکھنے کے لئے میں ایسی ایسی میعادیں کاٹ سکتا ہوں ۔

ملاپ

(۱)

لالہ گیان چند بیٹھے بیٹھے حساب کتاب جانچ رہے تھے کہ اُن کے صاحبزادے بابو نانک چند آئے اور بولے۔ دادا! اب یہاں پڑے پڑے جی اُکتا گیا۔ آپ کی اجازت ہو تو میں سیر کو نکل جاؤں۔ صرف ایک مہینے میں لوٹ آؤں گا۔

نانک چند نہایت خوش وضع اور خوش رو جوان تھا۔ رنگ پیلا، آنکھوں کے گرد حلقے، شانے جھکے ہوئے۔ گیان چند نے اس کی طرف تیکھی نگاہ سے دیکھا اور طنز آمیز لہجہ میں بولے۔ کیوں یہاں کیا تمہارے لئے کچھ کم دلچسپیاں ہیں۔

گیان چند نے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ان کی تنبیہ اور فہمائش مطلق کارگر نہ ہوئی۔ اس کی صحبت اچھی نہ تھی۔ شیشہ و ساغر اور راگ رنگ میں ڈوبا رہتا تھا۔ انہیں یہ نئی تجویز کیوں پسند آنے لگی تھی۔ لیکن نانک چند اُن کے مزاج سے واقف تھا۔ بے باکی سے بولا۔ "اب یہاں بھی جی نہیں لگتا۔ کشمیر کی بہت تعریف سُنی ہے۔ اب وہیں کا قصد ہے"

گیان چند۔ بہتر ہے تشریف لے جایئے۔

نانک چند (ہنس کر) روپے تو دلوایئے۔ اس وقت پانسو روپے کی سخت ضرورت ہے۔

گیان چند۔ ایسی فضولیات کا مجھ سے ذکر مت کرو۔ میں تم کو بارہا سمجھا چکا۔

نانک چند نے اصرار کرنا شروع کیا اور بوڑھے لالہ انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ نانک چند جھنجھلا کر بولا۔ اچھا کچھ مت دیجئے۔ میں یوں ہی چلا جاؤں گا۔

گیا نخچند نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ بے شک تم ایسے ہی ہمت ور ہو وہاں بھی تمہارے بھائی بند بیٹھے ہوئے ہیں نا۔

نانک چند مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے آپکا روپیہ آپ کو مبارک رہے۔

نانکچند کی یہ چال کبھی پٹ نہیں پڑتی تھی۔ اکیلا لڑکا تھا۔ بوڑھے لالہ صاحب ڈھیلے پڑ گئے۔ روپیہ دیا۔ خوشامد کی اور اسی دن نانک چند سیر کشمیر کے لئے روانہ ہوا۔

(۲)

مگر نانک چند یہاں سے تنہا نہ چلا آج کی عاشقانہ کوششیں بار آور ہو گئی تھیں۔ پڑوس میں بابو رام داس رہتے تھے۔ بیچارے سیدھے سادے آدمی۔ صبح کو دفتر جاتے اور شام کو آتے اور اس اثنا میں نانک چند اپنے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا ان کی بیوہ لڑکی سے محبت کے اشارے کنائے کیا کرتا۔ یہاں تک کہ بدنصیب للتا اس کے دام فریب میں آ پھنسی اغوا کے منصوبے ہوئے آدھی رات کا وقت تھا۔ للتا ایک سادی ساری پہنے چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ زیوروں کو اتار کر اس نے ایک صندوقچے میں رکھ دیا۔ اس کے دل میں اس وقت طرح طرح کے خیالات دوڑ رہے تھے۔ اور کلیجہ زور سے دھڑکتا تھا۔ مگر چاہے اور کچھ ہو نانک چند کی طرف سے اسے بیوفائی کا مطلق گمان نہ تھا۔ جوانی کی سب سے بڑی نعمت محبت ہے اور اس نعمت کو پا کر للتا اپنے تئیں خوش نصیب سمجھ رہی تھی۔ رام داس غافل سو رہے تھے کہ اتنے میں کنڈی کھٹکی۔ للتا چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے زیوروں کا صندوقچہ اٹھا لیا۔ ایک بار ادھر اُدھر حسرتناک نگاہوں سے دیکھا اور دبے پاؤں چونک چونک کر قدم اٹھاتی دہلیز میں آئی۔ اور کنڈی کھول دی۔ نانکچند نے اسے گلے سے لگا لیا۔ بگھی تیار تھی۔ دونوں اس پر جا بیٹھے۔

صبح کو بابو رام داس اٹھے۔ للتا نہ دکھائی دی۔ گھبرائے سارا گھر چھان مارا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ باہر کی کنڈی کھلی دیکھی۔ بگھی کے نشان نظر آئے۔ سر پیٹ کر بیٹھ گئے۔ مگر دردِ دل کس

سے کہنے۔ ہنسی اور بدنامی کا خوف زبان پر مُہر ہو گیا۔ مشہور کیا کہ وہ اپنے ننھیال چلی گئی ہے۔ مگر لالہ گیان چند سنتے ہی بھانپ گئے کہ سیر کشمیر کے کچھ اور ہی معنے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات سارے محلہ میں مشہور ہو گئی۔ یہاں تک کہ بابو رام داس نے مارے شرم کے خودکشی کر لی۔

(۳)

عاشقانہ سرگرمیاں انجام کی طرف سے بالکل بے خبر ہوتی ہیں۔ نانک چند جس وقت گاڑی میں للتا کے ساتھ بیٹھا تو اُسے بجز اس کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ کہ ایک نازنین میرے پہلو میں ہے۔ جس کے دل کا میں مالک ہوں۔ اسی دھن میں وہ مست تھا۔ رسوائی کا خوف قانون کا کھٹکا۔ معاش کے وسائل۔ ان مسئلوں پر خیال کرنے کی اُسے اس وقت فرصت نہ تھی۔ ہاں اُس نے کشمیر کا ارادہ ترک کر دیا اور کلکتہ جا پہنچا۔ کفایت شعاری کا سبق نہ پڑھا تھا جو کچھ جمع جتھا تھی۔ دو مہینوں میں صرف ہو گئی۔ للتا کے زیوروں پر نوبت آئی۔ لیکن نانک چند میں شرافت کا اتنا احساس باقی تھا۔ دل مضبوط کر کے باپ کو خط لکھا۔ حضرت عشق کو گالیاں دیں اور یقین دلایا کہ اب آپ کی قدمبوسی کے لئے طبیعت بے قرار ہے۔ کچھ خرچ بھیجئے۔ لالہ صاحب نے خط پڑھا۔ تسکین ہوئی کہ بارے زندہ اور بخیریت تو ہے۔ دھوم دھام سے ستیہ نارائن کی کتھا سُنی۔ روپیہ معاملہ کر دیا۔ لیکن جواب میں لکھا۔ کہ خیر جو کچھ تمہاری قسمت میں تھا وہ ہوا۔ ابھی اِدھر آنے کا ارادہ مت کرو۔ بہت بدنام ہو رہے ہو۔ تمہاری وجہ سے مجھے بھی برادری سے قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ اس طوفان کو فرو ہونے دو۔ تمہیں خرچ کی تکلیف نہ ہوگی۔ مگر اس عورت کی بانہہ پکڑی ہے۔ تو اس کا نباہ کرنا اسے اپنی بیاہتا استری سمجھو۔

نانک چند کے دل پر سے فکر کا بوجھ اُٹھ گیا۔ بنارس سے ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ادھر للتا کی کشش نے بھی کچھ دل کو کھینچا۔ انگور شراب کی لت نہ چھوٹی اور ہفتے میں دو دن ضرور تھیٹر دیکھنے جاتا۔ تاہم طبیعت میں سلامت روی اور اعتدال کا دخل ہو گیا تھا۔ اس طرح کلکتہ میں اس نے تین سال کاٹے۔ اسی اثنا میں اُسے ایک پیاری لڑکی کے باپ بننے کا سوبھاگیہ ہوا۔ جس کا نام اس نے کملا رکھا۔

(۴)

تیسرا سال گذرا ہی تھا کہ نانک چند کی اس پُرسکون زندگی میں اختلاج پیدا ہوا۔ لالہ گیاچند کا پچاسواں سال تھا۔ جو ہندوستانی ہنود کی طبعی عمر ہے۔ ان کا سرگباش ہو گیا اور جونہی یہ خبر نانک چند کو ملی۔ وہ للتا کے پاس جاکر چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ زندگی کے نئے نئے مسئلے اب اس کے سامنے آئے۔ اس تین سال کی میانہ روی نے اس کے دل سے اوباشی و بدمستی کے خیالات بہت دور کر دیے تھے۔ اسے اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ چل کر بنارس میں اپنی جائداد کا کچھ انتظام کرنا چاہیے ورنہ سارا کاروبار خاک میں مل جائیگا۔ لیکن للتا کو کیا کروں۔ اگر اسے وہاں لیے چلتا ہوں تو تین سال کے پُرانے واقعات تازہ ہو جائیں گے۔ وہ پھر ایک ہلچل پیدا ہوگی۔ جو مجھے حکام اور ہمچشموں میں ذلیل کر دے گی۔ علاوہ بریں اسے اب قانونی اولاد کی ضرورت بھی نظر آنے لگی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ للتا کو اپنی منکوحہ بیوی مشہور کرتا۔ لیکن اس عام خیال کو دور کرنا غیر ممکن تھا۔ کہ اس نے اسے اغوا کیا۔ للتا سے نانک چند کو اب وہ عاشقانہ محبت نہ تھی۔ جس میں سوز اور اضطراب کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ وہ اب ایک معمولی شوہر تھا۔ جو گلے میں پڑے ہوئے ڈھول کو پیٹنا ہی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جسے بیوی کی محبت اسی وقت آتی ہے۔ جب وہ بیمار ہوتی ہے۔ اور کوئی حیرت کا مقام نہیں ہے۔ اگر زندگی کی نئی نئی اُمنگوں نے اُسے اُکسانا شروع کیا۔ وہ منصوبے پیدا ہونے لگے۔ جن کا دولت اور رسوخ سے تعلق ہے۔ انسانی جذبات کی یہی عام حالت ہے۔
نانک چند اب مضبوط ارادے کے ساتھ سوچنے لگا۔ کہ یہاں سے کیونکر بھاگوں اگر اجازت لے کر جاتا ہوں تو چار دن میں سارا پردہ فاش ہو جائے گا۔ اگر حیلہ کیے جاتا ہوں تو آج کے تیسرے دن للتا بنارس میں میرے سر پر سوار ہوگی۔ کوئی ایسی ترکیب نکالوں کہ ان مشکلات سے نجات ہو۔ سوچتے سوچتے اسے آخر ایک تدبیر سوجھی۔ وہ ایک دن شام کو سیر دریا کا بہانہ کر کے چلا اور رات کو گھر پر نہ آیا۔ دوسرے دن صبح کو ایک چوکیدار للتا کے پاس آیا اور اسے تھانہ میں لے گیا۔ للتا حیران تھی کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے وہاں

جا کر جو کیفیت دیکھی تو دُنیا آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ نانک چند کے کپڑے خون میں تربتر پڑے تھے۔ اس کی وہی سنہری گھڑی وہی خوبصورت چھتری وہی ریشمی صافہ سب وہاں موجود تھے۔ جیب میں اس کے نام کے چھپے ہوئے کارڈ تھے۔ کوئی شک نہ رہا کہ نانک چند کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ دو تین ہفتہ تک تھانہ میں تحقیقات ہوتی رہی۔ اور بالآخر قاتل کا پتہ چل گیا۔ افسرانِ پولیس کو بیش بہا انعامات ملے۔ اسے سراغ رسانی کا معجزہ سمجھا گیا۔ قاتل نے دلشفانہ رقابت کے جوش میں یہ حرکت کی۔ مگر ادھر تو غریب بے گناہ قاتل سُولی پر چڑھا ہوا تھا اور وہاں بنارس میں نانک چند کی شادی رچائی جا رہی تھی۔

(۵)

لالہ نانک چند کی شادی ایک رئیس کے خاندان میں ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ وہی پرانے ہم نشین آنے شروع ہوئے۔ پھر وہی مجلسیں آراستہ ہوئیں پھر شیشہ و ساغر کے دور چلنے لگے۔ اعتدال کا کمزور احاطہ نفسانی خواہشوں کو روک نہ سکا۔ ہاں اب ان رندیوں میں پردہ داری برتی جاتی ہے۔ اور متانت قائم رکھی جاتی ہے۔ سال بھر اسی بہار میں گزرا۔ نویلی بہو گھر میں کُڑھ کُڑھ کر مر گئی تپ دق نے اس کا دم تمام کر دیا۔ تب دوسری شادی ہوئی۔ مگر ان مستورات میں نانک چند کی حسن پرست آنکھوں کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ کبھی بے روئے لقمہ منہ میں نہیں دیا۔ تین سال میں چل بسیں۔ تب تیسری شادی ہوئی۔ یہ عورت بے حد حسین تھی۔ سلیقہ کے زیور سے آراستہ۔ اس نے نانک چند کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ اور نانک چند خاندانی مسرتوں سے مانوس ہونے لگا۔ علائق دنیا کی دلفریبیاں اپنی طرف کھینچنے لگیں مگر پلیگ کے ایک ہی حملے نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ وفادار بیوی مری۔ تین برس کا پیارا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ اور دل پر ایسا داغ چھوڑ گیا۔ جس کا کوئی مرہم نہ تھا۔ بے اعتدالیاں بھی رخصت ہوئیں۔ عیش پرستیوں کا بھی خاتمہ ہوا۔ دل پر رنج و ملال کا غلبہ ہو گیا اور طبیعت دُنیا سے بیزار ہو گئی۔

(۶)

حادثات زندگی میں اکثر بڑے اہم اخلاقی پہلو پوشیدہ ہوا کرتے ہیں۔ ان صدمات نے نانک چند کے دل پر مرے ہوئے انسان کو بیدار کر دیا۔ جب وہ حسرت و یاس کی جگر خراش تنہائی میں پڑا ہوا ان واقعات کو یاد کرتا۔ تو اس کے دل پر رقت طاری ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ایشور نے مجھے میرے گناہوں کی سزا دی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ اُف! میں نے اس معصوم عورت پر کیسا ظلم کیا۔ کیسی بیرحمی تھی۔ یہ اسی کا خمیازہ ہے۔ یہ سوچتے سوچتے للتا کی موہوم تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اور پیارے مکھڑے والی کملا اپنے مرے ہوئے سوتیلے بھائی کے ساتھ اس کی طرف پیار سے دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس مدت دراز میں نانک چند کو للتا کی یاد تو بارہا آئی تھی۔ مگر عیش و عشرت کے مزوں اور جام و سبو کی متلون کیفیتوں نے کبھی اس خیال کو جمنے نہ دیا۔ ایک دھندلا سا خواب دکھائی دیا اور پریشان ہو گیا۔ معلوم نہیں دونوں مر گئیں یا زندہ ہیں۔ افسوس ایسی بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر میں نے ان کی سدھ تک نہ لی۔ اس نیک نامی پر لعنت ہے۔ جس کے لئے ایسی بے رحمیوں کی قیمت دینی پڑے۔ یہ خیال آخر اس کے دل پر ایسا مسلط ہوا کہ ایک روز وہ کلکتہ کو روانہ ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا وہ کلکتہ پہنچا اور اپنے اسی پرانے آشیانہ کو چلا۔ سارا شہر کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ بہت تلاش کے بعد اسے اپنا پرانا گھر نظر آیا۔ اس کے دل میں زور سے دھڑکن ہونے لگی۔ اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس نے ایک پڑوسی سے پوچھا۔ اس مکان میں کون رہتا ہے؟ بوڑھا بنگالی تھا۔ بولا۔ "ہام یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون ہے۔ کون نہیں ہے۔ اتنا بڑا ملک۔ کون کس کو جانتا ہے۔ ہاں ایک لڑکی اور اس کا بوڑھا ماں دو عورت رہتا ہے۔ بیوہ لوگ ہے۔ کپڑے کی سلائی کرتا ہے۔ جب سے اس کا آدمی مر گیا۔ تب سے یہی کام کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک تیرہ چودہ سال کی خوب صورت لڑکی کتاب لئے ہوئے باہر نکلی۔ نانک چند پہچان گیا کہ یہ کملا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ بے اختیار جی چاہا۔ کہ اس لڑکی کو سینہ سے چمٹا لے۔ کوبیر کی دولت مل گئی۔ آواز کو سنبھال کر بولا۔

"بیٹی جاکر اپنی ماں سے کہہ دو۔ کہ بنارس سے ایک آدمی آیا ہے۔"

لڑکی اندر چلی گئی۔ اور تھوڑی دیر میں للتا دروازہ پر آئی۔ اس کے چہرہ پر گھونگھٹ تھا۔ اور گو حسن کی تازگی نہ تھی۔ مگر اس کی دلفریبیاں قائم تھیں۔ نانک چند نے اُسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ عصمت اور صبر اور مایوسی کی زندہ مورت سامنے کھڑی ہے۔ اس نے بہت اصرار کیا۔ مگر ضبط نہ ہوسکا۔ بے اختیار رونے لگا۔ للتا نے اُسے گھونگھٹ کی آڑ سے دیکھا۔ اور دریائے حیرت میں غرق ہوگئی۔ وُہ تصویر جو لوحِ خیال پر منقوش تھی۔ اور جو زندگی کی چند روزہ بہار کی یاد دلاتی رہتی تھی جو خوابوں میں سامنے آ آکر کبھی خوشی کے نغمے سُناتی تھی اور رنج کے تیر چبھاتی تھی۔ اس وقت زندہ متحرک سامنے کھڑی ہے۔

للتا پر ایک نیم بے خبری کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ وہی حالت جو انسان کو خواب میں ہوتی ہے۔ وُہ ایک بے تابانہ جوش کے ساتھ نانک چند کی طرف بڑھی اور روتی ہوئی بولی۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے اکیلے کس پر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اب یہاں رہا نہیں جاتا۔"

للتا کو اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ وہ اس شخص کے سامنے کھڑی ہے۔ جو مدت ہوئی۔ لقمۂ اجل ہو چکا۔ ورنہ شائد وُہ چیخ کر بھاگتی۔ اس پر ایک خواب کی حالت طاری تھی۔ مگر جب نانک چند نے اسے سینہ سے لگا کر کہا۔" للتا! اب تم کو اکیلے نہ رہنا پڑیگا

تمہیں ان آنکھوں کی پُتلی بنا کر رکھوں گا۔ مَیں اسی لئے تمہارے پاس آیا ہُوں۔ مَیں اب تک نرک میں تھا۔ اب تمہارے ساتھ سُورگ کا سُکھ بھوگوں گا۔"

تو للتا چونکی اور الگ ہٹ کر بولی۔

"آنکھوں کو تو یقین آ گیا۔ مگر دل کو نہیں آتا۔ ایشور کرے یہ خواب نہ ہو۔"

علیحدگی

(۱)

بھولا مہتو نے پہلی عورت کے مرجانے کے بعد دوسری سگائی کی تو اس کے لڑکے رگھو کے لئے مصیبت کے دن آ گئے۔ رگھو کی عمر اس وقت کُل ۱۰ برس کی تھی۔ مزے سے گاؤں میں گلی ڈنڈا کھیلتا پھرتا تھا۔ نئی ماں کے آتے ہی چکی میں جُتنا پڑا۔ پنّا حسین عورت تھی اور حُسن کے ساتھ غرور بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی موٹا کام نہ کرتی۔ گوبر رگھو نکالتا۔ بیلوں کو سانی رگھو دیتا۔ رگھو ہی گھر کے جُوٹھے برتن مانجتا۔ بھولا کی آنکھیں کچھ ایسی پھریں کہ اسے اب رگھو میں بُرائیاں ہی نظر آتیں۔ پنّا کی باتوں کو وہ رواج قدیم کے مطابق آنکھیں بند کر کے مان لیتا تھا۔ رگھو کی شکایتوں کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رگھو نے شکایت کرنی چھوڑ دی۔ کس کے سامنے روئے۔ باپ ہی نہیں۔ سارا گاؤں اس کا دشمن تھا۔ بڑا ضدی لڑکا ہے۔ پنّا کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ بیچاری اس کا دلار کرتی ہے۔ کھلاتی پلاتی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ دوسری عورت ہوتی تو نباہ نہ ہوتا۔ وہ تو کہو پنّا اتنی سیدھی ہے کہ نباہ ہو جاتا ہے۔ زبردست کی شکائتیں سب سُنتے ہیں۔ کمزور کی فریاد کوئی نہیں سُنتا۔ رگھو کے دل میں ماں کی جانب سے روزبروز مغائرت بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آٹھ سال گزر گئے۔ اور ایک دن بھولا کے نام موت کا پیغام آ پہنچا۔

پنّا کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اتنا بڑا خرچ اور کمانے والا کوئی نہیں۔ رگھو اب کیوں بات پوچھنے لگا۔ یہ بات مانی ہوئی تھی۔ اپنی بیوی لائے گا۔ اور الگ رہے گا۔ بیوی آکر اور بھی لگائے گی۔ پنّا کو چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو

وہ رگھو کی دست نگر بن کر گھر میں نہ رہے گی۔ جس گھر میں اس نے راج کیا۔ اس میں لونڈی نہ بنے گی۔ جس لونڈے کو اپنا غلام سمجھا۔ اس کا منہ نہ تاکے گی۔ وہ حسین تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کا حسن ابھی پوری بہار تھا۔ وہ کوئی دوسرا گھر کرے گی یہی ہوگا نا لوگ ہنسیں گے۔ ہنسنے دو۔ اس کی برادری میں کیا ایسا ہوتا نہیں۔ باہمن۔ ٹھاکر تھوڑے ہی ہیں کہ ناک کٹ جائے گی۔ گھر میں چاہے جو کچھ کریں۔ باہر پردہ ڈھکا رہتا ہے۔ یہاں تو سنسار کو دکھا کر دوسرا گھر کر سکتی ہوں۔ رگھو کی دبیل بن کر کیوں رہوں۔

بھولا کو مرے ایک مہینہ گزر گیا۔ شام ہو گئی۔ پنا اسی تشویش میں پڑی تھی کہ یکایک اسے خیال آیا۔ لڑکے گھر میں نہیں ہیں۔ بیلوں کے آنے کا وقت ہے۔ کہیں راستے میں نہ چھٹ جائیں اب دروازہ پر کون ہے۔ جو ان کی نگرانی کریگا۔ رگھو تو یہی چاہے گا۔ کہ نہ کچلے ہوں۔ تو کچل جائیں۔ میرے لڑکے تو اسے پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتے۔ کبھی ہنس کر نہیں بولتا۔ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا رگھو سامنے جھونپڑے میں بیٹھا اوکھ کی گنڈیریاں بنا رہا ہے۔ تینوں لڑکے اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور چھوٹی لڑکی اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ ماں کی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ آج تو یہ نئی بات ہے۔ شاید دنیا کو دکھاتا ہے۔ کہ میں اپنے بھائیوں کو کتنا چاہتا ہوں۔ اور من میں چھری رکھی ہوئی ہے۔ گھات ملے تو جان ہی لے لے۔ کالا سانپ ہے کالا سانپ۔ تند لہجہ میں بولی۔ تم سب کے سب وہاں کیا کرتے ہو۔ گھر میں آؤ۔ سانجھ کی بیرا ہے۔ گورو آتے ہوں گے۔

رگھو نے التجا کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو ہوں ہی کاکی۔ ڈر کس بات کا ہے؟ بڑا لڑکا کیدار بولا۔ کاکی۔ رگھو دادا نے آج ہمارے لئے دو گاڑیاں بنا دی ہیں۔ یہ دیکھ ایک پر ہم اور کھنو بیٹھیں گے۔ دوسری پر لچھمن اور جھنیا۔ دادا دونوں گاڑیاں کھینچیں گے۔

یہ کہہ کر وہ ایک کونے سے دو چھوٹی چھوٹی گاڑیاں نکال لایا۔ چار چار پہیے لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لئے تختے تھے۔ اور روک کے لئے دونوں طرف بازو لگے ہوئے تھے۔

پنّا نے تعجب سے پُوچھا۔ گاڑیاں کس نے بنائیں؟

کیدار نے کچھ چڑ کر کہا۔ رگھو دادا نے بنائی ہیں اور کس نے۔ بھگت کے گھر سے بسولا اور رکھانی مانگ لائے اور چٹ پٹ بنا دیں۔ خوب دوڑتی ہیں کاکی۔ بیٹھ کھنّو۔ میں کھینچوں۔

کھنّو گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیدار کھینچنے لگا۔ چرچر کا شور ہوا (گویا گاڑی بھی اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شریک ہے۔ لچھمن نے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر کہا۔ دادا! کھینچو۔ رگھو نے جھنیا کو بھی گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور گاڑی کھینچتا ہوا دوڑا۔ تینوں لڑکے تالیاں بجانے لگے۔ پنّا تعجب آمیز نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی۔ یہ وہی رگھو ہے۔ یا کوئی اور۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں گاڑیاں لوٹیں۔ لڑکے گھر میں جاکر ہوائی سیر کے تجربات بیان کرنے لگے۔ کتنے خوش تھے سب۔ گویا ہوائی جہاز پر بیٹھ آئے ہوں۔

کھنّو نے کہا۔ کاکی! سب پیڑ دوڑ رہے تھے۔

لچھمن۔ اور بچھیاں کیسی بھاگیں۔ سب کی سب دوڑیں۔

کیدار۔ کاکی! رگھو دادا دونوں گاڑیاں ایک ساتھ کھینچ لے جاتے ہیں۔

جھنیا سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی قوتِ اظہار حرکات اور نگاہوں تک محدود تھی۔ تالیاں بجا بجا کر ناچ رہی تھی۔

کھنّو۔ اب ہمارے گھر گائے بھی آجائے گی کاکی! رگھو دادا نے گردھاری سے کہا ہے۔ کہ ہمیں ایک گائے لادو۔ گردھاری بولا۔ کل لاؤں گا۔

کیدار۔ تین سیر دودھ دیتی ہے کاکی! خوب دودھ پئیں گے۔

اتنے میں رگھو بھی اندر آگیا۔ پنّا نے سرزنش کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا۔ کیوں رگھو! تُم نے گردھاری سے کوئی گائے مانگی ہے؟

رگھو نے عذر خواہانہ انداز سے کہا۔ ہاں مانگی تو ہے۔ کل لائے گا۔

پینا۔ روپے کس کے گھر سے آدیں گے یہ بھی سوچا ہے؟

رگھو۔ سب سوچ لیا ہے کاکی! میرے یہ موہر نہیں ہے۔ اس کے پچیس روپے مل رہے ہیں۔ پانچ روپے بچھیا کے مجرا دے دوں گا۔ بس گائے اپنی ہو جائے گی۔

پنا سناٹے میں آ گئی۔ اب اس کا منکر دل بھی رگھو کی شرافت اور محبت کو نہ جھٹلا سکا۔ موہر کیوں بیچتے ہو گائے کی ابھی کون جلدی ہے۔ ہاتھ میں پیسے ہو جائیں تو لے لینا۔ سونا گلا اچھا نہ لگے گا۔ اتنے دنوں گائے نہیں رہی تو کیا مر کے نہیں رہے؟

رگھو ناصحانہ انداز سے بولا۔ بچوں کے کھانے پینے کے یہی دن ہیں کاکی! اس عمر میں نہ کھایا تو پھر کب کھائیں گے۔ موہر پہننا مجھے اب اچھا بھی نہیں لگتا۔ لوگ سمجھتے ہوں گے باپ مر گیا ہے اور اسے موہر پہننے کی سوجھی ہے۔

بھولا مہتو گائے کی فکر ہی میں چل بسے۔ نہ روپے آئے نہ گائے ملی۔ مجبور تھے۔ رگھو نے وہ مشکل کتنی آسانی سے حل کر دی۔ آج زندگی میں پہلی بار پنا کو رگھو پر اعتبار آیا اس کے لئے مادرانہ الفت کے دروازے بند تھے۔ آج وہ پہلی بار کھلے منہ بولی۔ جب گہنا ہی بیچنا ہے تو اپنی موہر کیوں بیچو گے۔ میری ہنسلی لے لینا۔

رگھو۔ نہیں کاکی وہ تمہارے گلے میں بہت اچھی لگتی ہے۔ مردوں کو کیا۔ موہر پہنیں چاہے نہ پہنیں۔

پنا۔ چل میں بوڑھی ہوئی۔ مجھے اب ہنسلی پہن کر کیا کرنا ہے۔ تو ابھی لڑکا ہے۔ تیرا سونا گلا اچھا نہ لگے گا۔

رگھو مسکرا کر بولا۔ تم ابھی سے کیسے بوڑھی ہو گئیں گاؤں میں کون تمہارے برابر ہے؟

رگھو کی اس سادہ لوحانہ تنقید نے پنا کو شرمندہ کر دیا۔ اس کے روکھے مرجھائے چہرہ پر تازگی دوڑ گئی۔

پانچ سال گزر گئے۔ رگھو کا سا جفاکش ایماندار بات کا دھنی دوسرا کسان گاؤں میں نہ تھا۔ پنّا کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا۔ اس کی عمر اب ۲۳ سال کی ہو گئی تھی۔ پنّا بار بار کہتی۔ بھیا! بہو کو بدا کرا لاؤ۔ کب تک وہ نیہر میں پڑی رہے گی۔ سب لوگ مجھی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہی بہو کو نہیں لانے دیتی۔ مگر رگھو ٹال دیتا۔ کہتا ابھی جلدی کیا ہے۔ اسے اپنی بیوی کے رنگ ڈھنگ کی کچھ خبر ہو گئی تھی۔ ایسی عورت کو گھر میں لا کر وہ دردِ سر نہ مول لینا چاہتا تھا۔ آخر ایک دن پنّا نے بضد ہو کر کہا۔ تو تم نہ جاؤ گے؟

کہہ دیا ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔

تمہارے لئے جلدی نہ ہو گی۔ میرے لئے تو جلدی ہے۔ میں آج کوی بھیجتی ہوں

کھنساؤ گی کاکی! اس کا مجاز اچھا نہیں ہے۔

تمہاری بلا سے جب میں اس سے بولوں گی ہی نہیں تو کیا ہوا سے لڑے گی روٹیاں تو بنا دے گی۔ مجھ سے اب بھیتر باہر کا سارا کام نہیں ہو گا۔ میں آج بلائے لیتی ہوں۔

بلانا چاہتی ہو بلا لو۔ مگر پھر یہ نہ کہنا کہ یہ مہریا کو ٹھیک نہیں کرتا۔ اس کا غلام ہو گیا ہے۔

نہ کہوں گی۔ جا کر دو ساڑیاں اور مٹھائی لیتا آ۔

تیسرے دن ملیا میکے سے آ گئی۔ دروازہ پر نقارہ بجا۔ شہنائیوں کی خوش آئند صدا بلند ہوئی۔ منہ دکھاوے کی رسم ادا ہوئی۔ بہو کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئیں۔ وہ اس خارزار میں گلِ صد برگ تھی۔ گیہوئی رنگ تھا۔ غنچہ کا دہن۔ بیضاوی چہرہ۔ ٹھوڑی کھنچی ہوئی رخساروں پر دلآویز سرخی۔ بڑی بڑی نکیلی پلکیں۔ آنکھوں میں ایک عجیب التجا۔ ایک دلکش معصومیت۔ رگھو اسے دیکھتے ہی اپنی ساری خودداریاں بھول گیا۔ صبح کے وقت ملیا کنوئیں سے پانی کا گھڑا لے کر چلتی تو اس کا آنچل ملتا طلوع کی سنہری کرنوں سے کندن ہو جاتا گویا بسنت اپنی ساری خوشبو اور شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی جاتی ہو۔

(٣)

مُلیا میکے سے ہی شمشیر برہنہ آئی تھی۔ میرا شوہر چھاتی پھاڑ کر کام کرے اور پنا رانی بنی بیٹھی رہیں۔ ان کے لڑکے رئیس زادے بنے گھومیں۔ مُلیا سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ وہ کسی کی غلامی نہ کرے گی۔ اپنے لڑکے تو اپنے ہوتے نہیں۔ بھائی کس کے ہوتے ہیں۔ جب تک پر نہیں کھلے ہیں رگھو کو گھیرے ہوئے ہیں جونہی ذرا سیانے ہوئے پر جھاڑ کر نکل جائینگے بات بھی نہ پوچھینگے۔ ایک دن اس نے رگھو سے کہا۔ تمہیں اس طرح غلامی کرنی ہو تو کرو۔ مجھ سے تو نہ ہوگا

رگھو۔ تو پھر کیا کروں تو ہی بتا۔ لڑکے ابھی گھر کا کام کرنے لائق بھی تو نہیں ہوئے۔

مُلیا۔ لڑکے راوت کے ہیں کچھ تمہارے نہیں ہیں۔ یہی پنا ہے جو تمہیں دانہ دانہ کو ترساتی تھی۔ سب سُن چکی ہوں۔ میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپے پیسے کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کیا لاتے ہو اور وہ کیا کرتی ہے۔ ڈھائی سو کا گُڑ بکا روپے کہاں گئے۔ مجھے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔ تم تم سمجھتے ہو روپے گھر ہی میں تو ہیں مگر دیکھ لینا جو تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی ملے۔

رگھو۔ تو گھر کی مالکن بن جائے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ یہ تو سوچ۔

مُلیا۔ دُنیا جو چاہے کہے۔ دُنیا کے ہاتھوں بِکی نہیں ہوں۔ دیکھ لینا۔ بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہی رہے گا۔ پھر تم اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے لئے مرو۔ میں کیوں مروں؟

رگھو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے جس بات کا خوف تھا وہ سر پڑ ہی گئی اور اتنی جلدی۔ اب اگر اس نے بہت تھتھمبو کیا تو سال چھ مہینے اور کام چلیگا۔ بس آگے کو لگا چلتا نظر نہیں آتا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

ایک دن پنا نے مہوے کا سکھاون ڈالا۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔ بکھار میں اناج گیلا ہو رہا تھا۔ مُلیا سے بولی۔ بہو ذرا دیکھتی رہنا۔ میں تب تک تالاب سے نہا آؤں۔

مُلیا نے لاپرواہی سے کہا۔ مجھے نیند آ رہی ہے تم بیٹھ کر دیکھو۔ ایک دن نہ نہاؤ گی تو کیا ہوگا۔

پنا نے ساڑی اُتار کر رکھ دی۔ نہانے نہ گئی۔ مُلیا کا وار خالی گیا۔

کئی دن کے بعد ایک شام کو پنّا دھان روپ کر لوٹی تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ دن بھر کی بھوکی تھی۔ اُمید تھی کہ جاتے جاتے بہو کھانا دے دیگی مگر یہاں دیکھا تو چولھا ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور بچّے مارے بھوک کے تڑپ رہے تھے۔ مُلیا سے تعجب سے پُوچھا۔ کیا آج ابھی چولھا نہیں جلا۔

کیدار نے کہا آج تو دوپہر کو بھی چولھا نہیں جلا کاکی! بھابی نے کچھ بنایا ہی نہیں۔

پنّا۔ تو تم لوگوں نے کھایا کیا؟

کیدار۔ کچھ نہیں۔ رات کی روٹیاں تھیں۔ کھنّو اور لچھمن نے کھائیں۔ میں نے ستّو کھایا۔

پنّا۔ اور بہو؟

کیدار۔ وہ تو پڑی سو رہی ہیں۔ کچھ نہیں کھایا۔

پنّا نے اسی وقت چولھا جلایا اور کھانا پکانے بیٹھ گئی۔ آٹا گوندھتی تھی اور روتی تھی کیا نصیب ہے۔ دن بھر کھیت میں جلی۔ گھر آئی تو چولھے کے سامنے جلنا پڑا۔

کیدار کا چودھواں سال تھا بھابی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ساری کیفیت سمجھ رہا تھا بولا۔ کاکی! بھابی اب ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔

پنّا نے چونک کر کہا۔ کیا کچھ کہتی تھی۔

کیدار۔ کہتی کچھ نہیں تھی۔ مگر ان کے من میں یہی بات ہے۔ پھر تم کیوں نہیں اُنہیں چھوڑ دیتیں جیسے چاہے رہے۔ ہمارا بھی بھگوان ہے۔

پنّا نے دانتوں سے زبان دبا کر کہا۔ چُپ میرے سامنے ایسی بات کبھی بھول کر بھی نہ کہنا۔ رگھو تمہارا بھائی نہیں۔ تمہارا باپ ہے۔ مُلیا سے کبھی بولے تو سمجھ لینا زہر کھا لوں گی۔

(۵)

دسہرے کا تہوار آیا۔ اس گاؤں سے کوس بھر ایک پُروے میں میلہ لگتا تھا۔ گاؤں کے سب لڑکے میلہ دیکھنے چلے۔ پنّا بھی لڑکوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئی مگر پیسے کہاں سے آئیں کنجی تو مُلیا کے پاس تھی۔

رگھو نے آ کر ملیا سے کہا۔ لڑکے میلے جا رہے ہیں۔ دو دو آنے کے پیسے سبھوں کو دے دے

ملیا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ پیسے گھر میں نہیں ہیں۔

رگھو۔ روپے تو ابھی تیلہن بیچ کر لایا تھا۔ کیا اتنی جلدی اُٹھ گئے؟

ملیا۔ ہاں اُٹھ گئے۔

رگھو۔ کہاں اُٹھ گئے جانوں۔ آج تیوہار کے دن لڑکے میلہ دیکھنے نہ جائیں گے۔

ملیا۔ اپنی کاکی سے کہو۔ پیسے نکالیں۔ گاڑھ کر کیا کریں گی۔

کھونٹی پر کنجی لٹک رہی تھی۔ رگھو نے کنجی اُتاری اور چاہا کہ صندوق کھولے کہ ملیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ کنجی مجھے دیدو۔ نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔ میں ایک پیسہ نہ دوں گی۔ کھانے پہننے کو بھی چاہیے۔ کاغذ کتاب کو بھی چاہیے۔ بھینس بھاٹے کو بھی چاہیے اس پر میلہ دیکھنے کو بھی چاہیے۔ ہماری کمائی اسی لئے نہیں ہے۔ کہ دوسرے کھائیں اور مونچھوں پر تاؤ دیں

پنا نے رگھو سے کہا۔ بھیا لڑکے میلہ دیکھنے نہ جائیں گے۔ پیسے کہاں ہیں گے۔

رگھو نے غضبناک ہو کر کہا۔ میلہ دیکھنے کیوں نہ جائینگے۔ سارا گاؤں جا رہا ہے۔ ہمارے ہی لڑکے نہ جائیں گے۔

رگھو نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور لڑکوں کو پیسے نکال کر دے دیئے۔ مگر جب کنجی ملیا کو دینے لگا۔ تو اس نے اسے آنگن میں پھینک دیا اور منہ لپیٹ کر لیٹ رہی۔

لڑکے میلہ دیکھنے نہ گئے۔

اس کے بعد دو دن گذر گئے۔ ملیا نے کچھ نہیں کھایا۔ پنا بھی بھوکی رہی۔ رگھو کبھی اسے مناتا۔ کبھی اُسے۔ پر یہ نہ اُٹھتی۔ نہ وہ۔ آخر رگھو نے حیران ہو کر ملیا سے پوچھا کچھ منہ سے تو کہہ تو چاہتی کیا ہے۔

ملیا نے زمین کو مخاطب کر کے کہا۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو۔

رگھو۔ اچھا اُٹھ۔ بنا کھا۔ پہنچا دوں گا۔

ملیا نے رگھو کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ڈر گئی۔ وہ طاقت وہ شوخی۔ وہ دلاویزی غائب ہو گئی تھی۔ دانت نکل آئے تھے۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ انگارے کی سی لال آنکھیں کر کے بولی۔ اچھا تو کاکی نے یہ صلاح دی ہے۔ یہ منتر پڑھایا ہے تو یہاں ایسی کچی نہیں ہوں۔ تم دونوں کی چھاتی پر مونگ دلوں گی۔ ہو کس پھیر میں۔

رگھو۔ اچھا مونگ ہی دل لینا۔ کچھ کھا پی لو گی۔ جبھی تو مونگ دل سکیگی۔

ملیا۔ اب تو جبھی منہ میں پانی ڈالوں گی۔ جب گھر الگ ہو جائے گا۔ بہت جھیل چکی اب نہیں جھیلا جاتا۔

رگھو سکتے میں آ گیا۔ ایک ہفتہ تک تو اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ علیحدگی کا اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا۔ اس نے گاؤں میں دو چار خاندانوں کو الگ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا روٹی کے ساتھ لوگوں کے دل بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہمیشہ کے لئے غیر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں وہی ناتا رہ جاتا ہے۔ جو گاؤں کے آدمیوں میں۔ رگھو نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس بلا کو اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دونگا۔ مگر ہونہار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ آہ میرے منہ کالکھ لگیگی دنیا یہی کہے گی۔ کہ باپ کے مر جانے پر دس سال بھی ایک گھر میں نباہ نہ ہو سکا۔ اور پھر کس سے الگ ہو جاؤں۔ جن کو گود میں کھلایا۔ جن کو بچوں کی طرح پالا۔ جن کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں انہیں سے الگ ہو جاؤں۔ اپنے پیاروں کو گھر سے نکال باہر کروں۔ اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں آخر اس نے مستقل انداز سے کہا۔ تو کیا چاہتی ہے۔ کہ میں اپنے بھائیوں سے الگ ہو جاؤں بھلا سوچ تو دنیا کیا کہے گی۔

ملیا۔ تو تم دنیا کو لے کر رہو۔ میرا سب کے ساتھ نباہ نہ ہوگا۔

رگھو۔ تو تو الگ ہو جا۔ مجھے کیوں اپنے ساتھ گھسیٹتی ہے۔

ملیا۔ تو مجھے کیا تمہارے گھر میں مٹھائی ملتی ہے۔ میرے لئے کیا سنسار میں جگہ نہیں ہے؟

رگھو۔ تیری جیسی مرضی جہاں چاہے رہ۔ میں اپنے گھر والوں سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جس دن

اس گھر میں دو چولہے جلیں گے۔ اُس دن میرے کلیجے کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ میں یہ
چوٹ سہہ نہیں سکتا۔ تجھے جو تکلیف ہو۔ میں دُور کر سکتا ہوں۔ مال اسباب کی مالکن تو تو ہے
ہی۔ اناج پانی بھی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اب رہ کیا گیا ہے۔ اگر تو کچھ کام دھندا نہیں کرنا چاہتی
مت کر۔ بھگوان نے مجھے سمائی دی ہوتی تو میں تجھے تنکا تک نہ اُٹھانے دیتا۔ تیرے یہ سکمار ہاتھ
پاؤں محنت مجوری کرنے کیلئے بنائے ہی نہیں گئے ہیں۔ مگر کیا کروں۔ اپنا کچھ بس نہیں ہے۔ پھر بھی تیرا
جی نہ چاہے۔ کوئی کام مت کر۔ مگر مجھ سے الگ ہونے کو نہ کہہ۔ تیرے پیروں پڑتا ہوں۔

مُلیا نے آنچل سر سے کھسکایا۔ اور ذرا قریب آ کر بولی۔ میں کام کرنے سے نہیں ڈرتی
نہ بیٹھے بیٹھے کھانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھ سے کسی کی دھونس نہیں سہی جاتی۔ تمہاری کاکی گھر کا کام
دھندا کرتی ہیں۔ تو اپنے لئے کرتی ہیں۔ اپنے بال بچوں کیلئے کرتی ہیں۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کرتی
پھر مجھ پر دھونس کیوں جماتی ہیں۔ انہیں اپنے بچے پیارے ہوں گے۔ مجھے تو تمہارا آسرا ہے۔ میں اپنی آنکھوں
سے یہ نہیں دیکھ سکتی کہ سارا گھر تو چین کرے۔ ذرا ذرا سے بچے تو دودھ پئیں اور جس کے بل بوتے
پر گرہستی چلتی ہے۔ وہ مٹھے کو ترسے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہ ہو۔ ذرا اپنا مُنہ تو دیکھو کیسی
صورت نکل آئی ہے۔ جو رات دن کام کرے گا اور کھانے کو دو ہی سوکھی روٹیاں پائے گا۔ اس کا کیا حال
ہوگا۔ ادھر دو ایک تو چار برس میں یہ پٹھے تیار ہو جائیں گے۔ تم تو دس سال میں کھاٹ پکڑ لو گے۔
یہ سب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو۔ کیا مار کر بھگا دو گے یا مجھے زبردستی باندھ
لو گے۔ یا مالکن کا حکم نہیں ہے۔ سچ کہتی ہوں۔ تم بڑے کٹھ کلیجے ہو۔ میں جانتی کہ ایسے نرموہی
سے پالا پڑے گا۔ تو اس گھر میں بھول کر بھی نہ آتی۔ آتی تو من نہ لگاتی۔ مگر اب تو تم سے من لگ
گیا ہے۔ گھر بھی جاؤں تو من یہیں رہے گا۔ اور تم ہو کہ میری بات نہیں پوچھتے۔

مُلیا کی یہ رسیلی دلجویانہ باتیں رگھو پر بے اثر ثابت ہوئیں۔ وہ اسی رُکھائی سے بولا مُلیا
یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ الگ ہونے کا دھیان کرتے ہی میرا من نہ جانے کیسا ہو جاتا ہے۔ یہ چوٹ
مجھ سے نہ سہی جائے گی۔

مُلیا نے منہ کو اُڑا کر کہا۔ تو چوڑیاں پہن کر اندر بیٹھو نہ۔ لاؤ میں مونچھیں لگا لوں۔ میں تو سمجھتی تھی تم میں بھی کچھ کس بل ہے۔ اب دیکھتی ہوں تو تم نرے مٹی کے لوندے ہو۔

پنّیا دالان میں کھڑی دونوں کی گفتگو سُن رہی تھی۔ اب اُس سے نہ رہا گیا۔ سامنے آ کر رگھو سے بولی۔ جب وہ الگ ہونے پر تلی ہوئی ہے تو تم کیوں اسے جبر جستی ملائے رکھنا چاہتے ہو۔ تم اسے لے کر رہو۔ ہمارے بھگوان مالک ہیں۔ جب مہتو مر گئے تھے اور کہیں روکھ کی چھاؤں نہ تھی جب اُس بپت میں بھگوان نے نباہ دیا تو اب کیا ڈر۔ اب تو بھگوان کی دیا سے تینوں لڑکے سیانے ہو گئے ہیں اب کوئی چنتا نہیں۔

رگھو نے آنسو بھری آنکھوں سے پنّیا کو دیکھ کر کہا۔ کاکی تو بھی پگلا گئی ہے کیا جانتی نہیں۔ دو روٹیاں ہوتے ہی دو من ہو جاتے ہیں؟

پنّیا۔ جب وہ مانتی ہی نہیں تو تم کیا کرو گے۔ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ تو کوئی کیا کرے گا۔ پرابدھ میں جتنے دن ایک ساتھ رہنا لکھا تھا اتنے دن رہے اب اس کی یہی مرضی ہے تو تم کیا کرو گے تم نے میرے بال بچوں کیلئے جو کچھ کیا وہ میں بھول نہیں سکتی۔ تم نے اُن کے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو آج اُن کی نہ جانے کیا گت ہوتی۔ نہ جانے کس کے دروازے پر ٹھوکریں کھاتے ہوتے نہ جانے کہاں کہاں بھیک مانگتے پھرتے۔ تمہارا جس مرتے دم تک گاؤں گی۔ اگر میری کھال تمہارے جوتے بنانے کے کام آئے تو خوشی سے دے دوں۔ چاہے تم سے الگ ہو جاؤں۔ لیکن جس گھڑی تم پکارو گے کتے کی طرح دوڑی آؤں گی۔ یہ بھول کر بھی مت سوچنا کہ تم سے الگ ہو کر میں تمہارا برا چیتوں گی جس دن تمہارا انبھل میرے من میں آئیگا۔ اُسی دن بس کھا کر مر جاؤں گی۔ بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔ مرتے دم تک یہی آسیس میرے روئیں روئیں سے نکلتی رہے گی۔ اور لڑکے بھی اگر اپنے باپ کے ہیں۔ تو مرتے دم تک تمہارا پوس مانیں گے۔

یہ کہہ کر پنّیا روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ رگھو وہیں مورت کی طرح کھڑا رہا۔ آسمان کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

(۵)

پنّا کی باتیں سُن کر مُلیا سمجھ گئی کہ اب اپنے پَو بارہ ہیں۔ گھر میں جھاڑو لگایا۔ چولھا جلایا اور کنوئیں سے پانی لانے چلی۔ اس کی ٹیک پوری ہو گئی تھی۔

گاؤں میں عورتوں کے دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک بہوؤں کا۔ دوسرا ساسوں کا۔ بہوئیں مشورے اور ہمدردی کے لئے اپنے فریق سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ساسیں اپنے فریق سے۔ دونوں کی پنچائتیں الگ ہوتی ہیں۔ جارحانہ اور مدافعانہ مسئلے وہیں سوچے جاتے اور طے ہوتے ہیں۔

مُلیا کو کنوئیں پر دو تین بہوئیں مل گئیں۔ ایک نے پوچھا۔ آج تو تمہاری بُڑھیا بہت رو دھو رہی تھی۔

مُلیا نے فاتحانہ مسرت سے کہا۔ "اتنے دنوں گھر کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ راج پاٹ چھوڑتے کسے اچھا لگتا ہے۔ بہن میں اُن کا بُرا نہیں چاہتی۔ لیکن ایک آدمی کی کمائی میں کہاں تک برکت ہوگی۔ میرے بھی تو کھانے پینے پہننے اوڑھنے کے دن ہیں۔ ابھی اُن کے پیچھے مرو پھر بال بچے ہو جائیں۔ اُن کے پیچھے مرو۔ ساری زندگی یہی کٹ جائے۔

بہو۔ بوڑھیاں یہی چاہتی ہیں۔ کہ یہ سب جنم بھر لونڈی بنی رہیں۔ موٹا جھوٹا کھائیں اور پڑی رہیں۔

دوسری بہو۔ کس بھروسے پر کوئی مرے اپنے لڑکے تو بات نہیں پوچھتے۔ پرائے لڑکوں کا کیا بھروسہ۔ کل ان کے ہاتھ پیر ہو جائیں گے۔ پھر کون پوچھتا ہے۔ اپنی اپنی جوریوں کا مُنہ دیکھیں گے۔ پہلے ہی پھٹکار دینا اچھا ہے۔ پھر تو کوئی کلنک نہ ہوگا۔

تیسری بہو۔ بڑھیا کے رونے دھونے میں نہ آجانا۔ نہیں پھر وہی پچھالیدر ہوگی۔

مُلیا پانی لے کر گئی۔ ایک دوسرا چولھا نکال کر جلایا۔ روٹیاں بنائیں اور رگھو سے بولی جاؤ نہا آؤ۔ روٹی تیار ہے۔

رگھو نے گویا سُنا ہی نہیں۔ سر پر ہاتھ رکھے۔ دروازہ کی طرف تاکتا رہا۔

مُلیا۔ کیا کہتی ہوں کچھ سنائی دیتا ہے۔ سویرا نہیں ہے۔ بارہ بج رہے ہیں۔

رگھو۔ سن تو رہا ہوں۔ کیا بہرا ہوں۔ روٹی تیار ہے تو جاکر کھالے۔ مجھے بھوک نہیں ہے

مُلیا نے دوبارہ کچھ نہ کہا۔ جاکر چولھا بجھا دیا۔ روٹیاں اُٹھاکر چھینکے پر رکھ دیں اور منہ ڈھانپ کر لیٹی رہی۔ یہ فاقے کا تیسرا دن تھا۔

ذرا دیر میں پنّا نے آکر رگھو سے کہا۔ کھانا تو تیار ہے بھیّا۔ نہا دھوکر کھالو۔ بہو تین دن کی بھوکی ہے۔

رگھو نے جھنجھلاکر کہا۔ کاکی تو گھر میں رہنے دے گی۔ کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ کھانا تو کھانا ہی ہے۔ آج نہ کھاؤں گا۔ کل کھاؤں گا۔ پیٹ پر بھی کوئی بس ہے۔ لیکن ابھی مجھ سے نہ کھایا جائے گا۔ کہاں ہیں لڑکے؟ دکھائی نہیں دیتے انہیں تو کھلا پلا دے

پنّا کے لئے اب چولھا جلانا لازم ہو گیا۔ جب تک وہ کھانا بنا کر لڑکوں کو نہیں کھلائے گی رگھو ہرگز نہ کھائیگا۔ اتنا ہی نہیں اُسے رگھو سے بیر مول لینا پڑے گا۔ اُسے طعنے سے چھیدنا پڑے گا۔ اس کے دل میں جلی کٹی باتوں سے منافرت کا بیج بونا پڑے گا۔ اس کے بغیر گذارے کی کوئی صورت نہیں۔ ورنہ غیرت مند رگھو یونہی فاقے کرتے کرتے ایک دن بیمار ہو جائے گا۔ اور شائد جان پر کھیل جائے۔ یہ سوانگ بھرتے ہوئے پنّا کو روحانی عذاب ہو رہا تھا۔ اُس کے منہ سے رگھو کے لئے گالیاں کیسے نکلیں گی۔ وُہ کیسے اُسے کوسنے دیگی۔ کیسے اُسے جلائے گی۔ بڑا مشکل معاملہ ہے۔ رگھو اُسے کتنی بے وفا کتنی بے مروت کتنی بے رحم سمجھنے لگے گا۔ مگر اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ یہ سوچکر اُس نے چولھا جلایا۔ کھانا بنایا۔ کیدار اور کھنّو مدرسے سے آگئے تھے۔ پنّا نے انہیں کھانے کو بُلایا۔ کیدار بولا۔ بھیّا نے تو ابھی کھایا ہی نہیں۔

پنّا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ وُہ اب تمہارے ساتھ نہ کھائیں گے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ مُلیا مہا منتھ مچائے ہوئے ہے۔

کیدار۔ بھیّا اُسے ڈانٹتے کیوں نہیں۔

پنّا۔ ڈانٹا تو بہت مگر وُہ مانتی ہی نہیں تو کیا کریں۔ ابھی تک مُنہ میں پانی نہیں ڈالا۔

کھنّو۔ تو کیوں اماں! ہم لوگ الگ الگ گھر میں رہیں۔

پنّا۔ چُپ چاپ بیٹھ رہا۔ بک بک مت کر۔

لڑکوں نے کھانا کھا لیا تو پنّا کھانے بیٹھی۔ لیکن لقمہ حلق کے نیچے نہ اُترتا تھا۔ لڑکوں کو
دکھانے کے لئے اُس نے بڑی مشکل سے دو چار لقمے پانی کے زور سے اُتارے اور اُٹھ کھڑی ہوئی
آج کئی برس کے بعد ایسا ہوا کہ اُس نے رگھو کو کھلائے بغیر خود کھایا۔ چاہے کھانے کا بہانہ ہی
کیا ہو۔ پھر باہر آکر رگھو سے بولی۔ تم جا کر کھاتے کیوں نہیں۔ کیا ہمارے اُوپر جان دو گے؟

رگھو نے خطاوار نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لڑکے کھا چکے۔

میرے لڑکوں کو کچھ کہوگے تو کہے دیتی ہوں۔ یہاں تمہاری پرواہ نہیں ہے۔ رانی روٹھیں
گی۔ اپنا سہاگ لیں گی۔ تم روٹھو گے تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنے پسینہ کی کمائی کھاتی ہوں کچھ
تمہارا دیا نہیں کھاتی۔

رگھو نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ پنّا اس قدر گرم ہو رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا
بولا۔ میں نے کچھ نہیں کہا کاکی!

پنّا۔ تُو مجھ سے کیا کہے گا۔ کیا تیری دبیل ہوں۔ یہاں بھگوان کے دیئے چار لڑکے ہیں۔

لڑکے کھانا کھا کر باہر نکلے تھے۔ سامنے باغ میں ہوا کے جھونکوں سے آم گر رہے تھے۔
گاؤں کے لڑکے درختوں کے نیچے جمع تھے۔ آم گرتے ہی کئی کئی ساتھ دوڑ پڑتے تھے۔ ایک پاتا تھا باقی
شرمندہ ہو جاتے تھے۔ لُو چل رہی تھی۔ بدن جُھلسا جاتا تھا۔ مگر آم کی دُھن میں کسی بات کی سُدھ
نہ تھی۔ کیدار اور اُس کے بھائی للچائی ہوئی نظروں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جانے کی ہمت
نہ پڑتی تھی۔ کہیں بھیا ڈانٹ نہ بیٹھیں۔ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لیکن جب پنّا اور رگھو میں
جھگڑا ہونے لگا۔ تو انھوں نے سمجھ لیا۔ اب علیحدگی پوری ہو گئی۔ پھر بھیا کا کیا ڈر۔

کیدار بولا۔ کھنّو چلو آم مار لائیں۔ خوب گر رہے ہیں۔

کھنّو۔ دادا جو بیٹھے ہیں۔

کیدار۔ دادا تو الگ ہو گئے۔ اب اُن سے کیا مطلب۔

کھنّو۔ نہ بھائی میں نہ جاؤں گا۔

لچھمن نے متانت سے کہا۔ تو ہم کو اب کوئی مارے گا۔ تب بھی دادا نہ بولیں گے؟

کیدار ۔ واہ! تب کیوں نہ بولیں گے۔

یہ کہتا ہوا کیدار چپکے سے باغ کی طرف کھسکا۔ اُس کی جرأت دیکھ کھنّو اور لچھمن کی ہمت بھی بندھی۔ وُہ بھی سرک گئے۔

یکایک رگھو کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ پنّا کا وُہ کٹار کا سا تیز وار اُسے یاد نہ رہا۔ بولا دیکھو لڑکے باغ میں جا رہے ہیں۔ تُو چل دی ہے۔

پنّا ۔ اب ان کا کون پُچھتر ہے یا آگ میں جائیں پیڑ پر چڑھیں ندی میں ڈوبیں تم سے مطلب

پنّا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ رگھو نے ناریل کھمبے سے لگا کر رکھ دیا اور باغ کی طرف دوڑا۔

(۶)

رگھو لڑکوں کو لے کر باغ سے لوٹا تو مُلیا جھونپڑے میں کھڑی تھی بولی۔ اب کھانے چلیے ہو کہ ابھی نہیں۔ رگھو نے جھنجھلا کر کہا۔ کھانا کیسے کھایا جاتا ہے ایک وقت نہ کھاؤں گا تو کون مرا جاتا ہوں کیا تو سمجھتی ہے آج گھر میں چھوٹی بات ہوگئی ہے تُو نے گھر میں چولہا نہیں جلایا۔ میرے کلیجے میں آگ لگائی ہے۔ مجھے گھمنڈ تھا اور چاہے کچھ ہو جائے مگر میرے گھر میں پھوٹ کا روگ نہ آنے پائے گا۔ پر تُو نے میرا گھمنڈ چُور چُور کر دیا اور تجھے کیوں الجام دوں۔ پرالبدھ کی بات ہے۔

مُلیا ۔ ہاں ہاں سُن چکی۔ جن کے نام پر تم دانہ پانی چھوڑے بیٹھے ہو۔ اُنہوں نے پہلے سے لڑکوں کو کھلایا۔ آپ کھایا اور اب چین کر رہی ہیں۔ تم اُن پر جان دیتے ہو۔ وہ بات بھی نہیں پوچھتیں مور پیا بات نہ پوچھیں مور سہاگن ناؤں۔

رگھو نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچ کر کہا۔ گھاؤ پر نمک نہ چھڑک مُلیا۔ مجھے چپ چاپ پڑا رہنے دے بتیرے کا دن ہی آج کاکی بھی مجھے گھڑکیاں سُنا گئی ہیں۔ سب پرالبدھ کی بات ہے۔ جن بچیوں کو میں اپنا سمجھتا تھا وُہ اب میری نہ رہیں گی۔ سامنے وُہ ہرے ہرے

پودے دیکھتے ہو۔ وہ میرے ہی لگائے ہوئے ہیں۔ مگر اب کوئی ان پر کلہاڑا بھی چلائے تو میں بول نہیں سکتا۔ اب کھیتوں میں مینڈیں پڑ جائیں گی گھر میں دیوار کھنچ جائے گی۔ بیل بدھے بٹ جائیں گے نہ جانے کون کونسی دُرگت سہنی پڑے گی۔ جن کو گود میں کھلایا۔ انہیں سے اب لاگ ڈانٹ کرنی پڑے گی۔ ان کے منہ کی روٹیاں چھین کر کھانی پڑیں گی یہ سب گرہستی میں نے جوڑی تھی اور آج میں اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی لگائی ہوئی کھیتی اُجاڑنی پڑے گی۔ جا مجھے چھوڑ دے ابھی مجھ سے کچھ نہ کھایا جائے گا۔

ملیا۔ میں قسم کھا دوں گی۔ نہیں چپکے سے چلے چلو۔

رگھو۔ دیکھ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اپنی ضد چھوڑ دے۔

ملیا۔ ہمارا ہی لہو پیئے جو کھانے نہ اُٹھے۔

رگھو نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہ تو نے کیا کیا ملیا۔ میں تو اُٹھ ہی رہا تھا۔ چل کھا لوں۔ نہانے دھونے کون جاتا ہے۔ دیر ہو گئی ہے لیکن کہے دیتا ہوں کہ چاہے چار کی جگہ چھ روٹیاں کھا جاؤں۔ چاہے تو مجھے گھی کے مٹکے میں ڈبو دے پر یہ داغ میرے دل سے نہ مٹے گا۔

ملیا۔ داغ واغ سب مٹ جائے گا۔ پہلے سب کو ایسا ہی لگتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ اُدھر کیسی چین کی بنسی بج رہی ہے۔ وہ تو منا رہی تھیں کہ کسی طرح یہ سب الگ ہو جائیں۔ اب وہ پہلے کی سی چاندی تو نہیں ہے کہ جو کچھ گھر میں آیا سب غائب۔ اب کیوں ساتھ رہنے لگیں۔ چین سے بنایا کھایا۔ ایک بار بھولے منہ سے بھی کہا۔ آؤ بھیا کھا لو۔

رگھو نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ اسی کا تو مجھے غم ہے۔ کاکی سے مجھے ایسی اُمید نہ تھی۔

رگھو کھانے بیٹھا تو لقمے زہر کے گھونٹ سے لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا روٹیاں بھوسی کی ہیں کوئی مزہ ہی نہیں۔ دال بالکل پانی سی لگتی ہے۔ پانی بھی حلق کے نیچے نہ اُترتا تھا۔ دودھ کی طرح دیکھا تک نہیں دو چار لقمے کھا کر چلا آیا۔ جیسے کسی عزیز کا ماتم کر کے لوٹا ہو۔

اس گھر پر آج نحوست برس رہی تھی۔ اسکی دیواریں کتنی بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ دروازہ کتنا

چھوٹا ہو گیا ہے۔ گویا کوئی سایۂ غم اس گھر پر چھا گیا ہو۔ گویا کسی کی روح ماتم کر رہی ہو۔

رات کا کھانا بھی اسی طرح کھایا۔ کھایا قسم توڑی کی۔ مگر رات بھر اس کا دل بے چین رہا۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر مسلط ہو رہی تھی۔ جیسے بھولا دروازہ پر بیٹھا بسور رہا ہو۔ وہ بار بار چونک کر اٹھتا۔ بھولا اس کی طرف تیز حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں وقت کھانا کھاتا تھا۔ پر جیسے دشمن کے گھر۔ بھولا کی ماتم کناں تصویر اس کی آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔ راتوں کو اسے نیند نہ آتی۔ وہ گاؤں میں نکلتا تو اس طرح منہ چرائے، سر جھکائے۔ گویا گئو ہتیا کی ہو۔

(۷)

پانچ سال گزر گئے۔ رگھو اب دو لڑکوں کا باپ تھا۔ آنگن میں دیوار کھنچ گئی تھی۔ کھیتوں میں مینڈھیں ڈال دی گئی تھیں۔ مویشی تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ کیدار کی عمر اب سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب کھیتی کا کام کرتا تھا۔ کھنو ابھی پرائیویٹ امتحان دینا چاہتا تھا۔ پر پڑھنا اس کا بھی چھوٹ چکا تھا۔ صرف لچھمن ابھی تک مدرسے جاتا تھا۔ پنا اور ملیا دونوں ایک دوسرے کی صورت سے جلتی تھیں۔ مگر ملیا کے دونوں لڑکے اکثر پنا کے پاس ہی رہتے تھے۔ وہی انہیں ابٹن ملتی۔ وہی کاجل لگاتی وہی گود میں لئے پھرتی اس خدمت کے صلے میں ملیا کی زبان پر شکریہ کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ نہ پنا اس کی طالب تھی۔ وہ جو کچھ کرتی تھی بے غرض کرتی تھی۔ اب اس کے دو لڑکے کام کرنے والے تھے۔ لڑکی کھانا پکا لیتی تھی۔ وہ خود اوپر کا کام کاج کرتی تھی۔ اس کے برعکس رگھو اپنے گھر کا اکیلا تھا۔ وہ بھی نیم جاں شکستہ حال۔ قبل از وقت بوڑھا۔ ابھی تیس سال کی ہی عمر تھی لیکن بال کھچڑی ہو گئے تھے کمر بھی جھک گئی تھی کھانسی بھی آنے لگی تھی۔ یاس و ناکامی کی زندہ تصویر۔ کھیتی پسینے کی ہے۔ وہ ٹھہرا اکیلا۔ کھیتوں کی خدمت جیسی چاہیے نہ ہوتی تھی۔ اچھی فصل کہاں سے آتی۔ کچھ مقروض بھی ہو گیا تھا۔ یہ فکر اور بھی مارے ڈالتی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اب اسے کچھ آرام ملتا۔ اتنے

دنوں کی شبانہ روز مشقت کے بعد اب بار کچھ ہلکا ہوتا۔ لیکن مُلیا کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی نے لہراتی ہوئی کھیتی میں آگ لگا دی۔ اگر جب ساتھ ہوتے تو وہ اس وقت پنشن پاتا۔ ہر سے دروازے پر بیٹھا ناریل پیتا۔ بھائی کام کرتے وہ صلاح بتاتا مگر وہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو فکروں کا ہجوم روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ آخر اُسے دھیما دھیما بخار رہنے لگا۔ پہلے کچھ پرواہ نہ کی سمجھا آپ ہی اچھا ہو جائیگا۔ مگر جب کمزوری بڑھنے لگی تو دوا کی فکر ہوئی جس نے جو بتایا وہ کھا لیا۔ ڈاکٹروں یا ویدوں کے پاس جانے کی توفیق کہاں اور ہوتی بھی تو پیسے خرچ کر دینے کے سوا اور نتیجہ ہی کیا تھا۔ تپ کہنہ کا علاج ہی کیا تھا۔ نہ وہ بسنت مالتی کا سیون کر سکتا تھا اور نہ کامل آرام و سکون کے ساتھ مقوی غذائیں کھا سکتا تھا۔ پنّا اب بھی موقعہ پاتی تو اُس کو تشفی دیتی تھی۔ لیکن اس کے لڑکے اب رگھو سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ دوا دارو تو کیا کرتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ بھیا سمجھتے تھے ہم لوگوں سے الگ ہو کر سونے کی اینٹ رکھ لیں گے بھابی بھی سمجھتی تھی۔ سونے سے لد جاؤں گی اب جان سے مر رہے ہیں۔ دیکھیں کون پوچھتا ہے بہت ہائے ہائے بھی اچھا نہیں ہوتا۔ آدمی کام اُتنا ہی کرے جتنا ہو سکے۔ یہ نہیں کہ روپیہ کے لئے جان ہی دے دے۔ رگھو کا قصور انہوں نے اب تک معاف نہ کیا تھا۔ کیدار ماں کے سمجھانے پر جواب دیتا۔ چل میں اُن کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم ان کی جگہ میں ہوتا تو ڈنڈے سے بات کرتا۔ مجال تھی کہ عورت یوں جیا کرتی۔ یہ سب بھیا کی چال تھی۔ سب سدھی بدی تھی۔

آخر ایک دن رگھو کی ٹمٹماتی ہوئی شمع حیات بجھ گئی۔ موت نے ساری فکروں کا خاتمہ کر دیا۔

(۴)

مُلیا کے لئے اب زندگی تاریک ہو گئی۔ اس کا غرور پامال ہو گیا۔ جس زمین پر اس نے اپنے منصوبوں کی دیوار کھڑی کی تھی۔ وہ نیچے سے کھسک گئی تھی۔ جس کھونٹے کے بل پر وہ اُچھل رہی تھی وہ اُکھڑ گیا تھا۔ بچاری دونوں لڑکوں کو لئے بیٹھا کرتی۔ گاؤں میں کسی کو مُنہ دکھانے

ہمت نہ ہوتی۔ ہمسایہ شخص اُس سے یہ کہتا تو معلوم ہوتا تھا: گھمنڈ کے مارے پاؤں زمین پر نہ رکھتی تھی۔ آخر مل گئی سزا کہ نہیں۔ اب کس گھر میں کیسے نباہ ہوگا؟ وہ کس کے سہارے رہے گی کس کے بل پر کھیتی ہوگی۔ بیچارہ رگھو بیمار تھا، نیم جان تھا۔ مگر جب تک رہا۔ اپنا کام کرتا رہا۔ ضعف کے مارے اکثر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور ذرا دیر دم لے کر پھر ہاتھ چلانے لگتا۔ اب کھیتی کون سنبھالے گا۔ سارے کام پھیلے پڑے تھے۔ اناج کی ڈانٹھیں کھلیان میں پڑی تھیں۔ اوکھ الگ سوکھ رہی تھی وہ اکیلی کیا کیا کرے گی۔ پھر سینچائی۔ اکیلے آدمی کا تو کام نہیں۔ تین تین آدمی درکار ہوں گے۔ مزدوروں سے کام لے تو مزدوری کہاں سے لائے۔ پھر اس وقت مزدور ملنے مشکل۔ آدمیوں کے لئے کھینچا تانی ہو رہی تھی کیا کرے کیا نہ کرے لیکن اب بھی اُسے اپنے الگ ہونے کا پچھتاوا نہ تھا۔ کم سے کم اب کھیت تو اپنے تھے۔ نہیں تو شاید حصہ بھی نہ ملتا۔ سب کی لونڈی بن کر رہنا پڑتا۔

اس طرح ۱۳ دن گذر گئے۔ کریا کرم سے فراغت ہوئی۔ دوسرے دن علی الصباح دونوں بچوں کو گود میں اُٹھایا اور اناج مانڑنے چلی۔ کھلیان میں پہنچ کر اُس نے ایک کو تو درخت کے نیچے گھاس کے نرم بچھاون پر سُلا دیا اور دوسرے کو وہیں بٹھا کر اناج مانڑنے لگی۔ بیلوں کو ہانکتی تھی اور روتی تھی کیا اِسی لئے بھگوان نے اُسے جنم دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ انہیں دنوں پچھلے سال بھی اناج مانڑا گیا تھا۔ وہ رگھو کے لئے لوٹے میں شربت اور مٹر کا چبینہ لے کر آتی تھی۔ آج اُس کے آگے ہے نہ پیچھے۔ یکایک بچے کا رونا سُن کر اس نے ادھر تاکا تو بڑا لڑکا کہہ رہا تھا۔ بیا چُپ رہو۔ چُپ رہو۔ دھیرے دھیرے اُس کے مُنہ پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ پھر خود لیٹ کر اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ اُسے اُٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ بھیا کو کیسے چپ کرائے۔ جب یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تو اس نے بھی رونا شروع کر دیا۔

اسی وقت پنا دوڑی ہوئی آئی اور چھوٹے بچے کو گود میں اُٹھا کر پیار کرتی ہوئی بولی۔ لڑکوں

کو مجھے کیوں نہ دے آئیں بہو؟ ہائے ہائے! بچارا دھرتی پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ جب مر جاؤں تو جو چاہے کرنا۔ ابھی تو میں جیتی ہوں۔ الگ ہو جانے سے بچے تو نہیں پرائے ہو گئے۔

ملیا نے کہا۔ تمہیں بھی چھٹی نہیں تھی اماں۔ کیا کرتی۔

تو تیرے یہاں آنے کی جلدی کیا تھی۔ ڈانٹھ ماڑ نہ جاتی۔ تین لڑکے تو ہیں اور کس دن کام آئیں گے۔

کیدار تو کل ہی ماڑنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا پہلے اوکھ میں پانی دے لو۔ تب اناج ماڑ لینا۔ مڑائی تو دس دن بعد بھی ہو سکتی ہے۔ اوکھ کی سنچائی نہ ہوئی تو سوکھ جائے گی۔ کل سے اوکھ میں پانی چڑھا ہوا ہے۔ پرسوں تک کھیت پُر ہو جائیں گے۔ تب مڑائی بھی ہو جائے گی۔ تجھے بسواس نہ آئیگا۔ جب سے بھیّا مرے ہیں۔ کیدار کو بڑی چنتا ہو گئی ہے۔ سو سو بار پوچھتا ہے۔ بھابی بہت روتی تو نہیں ہیں۔ دیکھ لڑکے بھوکے تو نہیں ہیں۔ کوئی لڑکا روتا ہے تو دوڑا آتا ہے۔ دیکھ اماں کیا ہوا۔ بچہ کیوں روتا ہے۔ کل رو کر بولا۔ اماں میں جانتا کہ بھیا نہ رہیں گے تو ان کی کچھ سیوا کر لیتا۔ یہاں جگائے جگائے اُٹھتا تھا۔ اب پہر رات سے اٹھ کر کام میں لگ جاتا ہے۔ کھنّو کل ذرا سا بولا۔ پہلے ہم اپنی اوکھ میں پانی دے لیں گے۔ پھر بھیا کی اوکھ میں دینگے۔ اس پر کیدار نے ایسے ڈانٹا کہ کھنّو کے منہ سے پھر بات نہ نکلی۔ بولا کیسی تمہاری اور کیسی ہماری اوکھ۔ بھیا نے جِلا نہ لیا ہوتا تو آج یا مر گئے ہوتے یا کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ آج تم بڑے اوکھ والے بنے ہو۔ یہ انہیں کا پُن پرتاپ ہے کہ آج بھلے بنے بیٹھے ہو۔ پرسوں گئی تو منڈیا میں چپ چاپ بیٹھا رو رہا تھا۔ پوچھا کیوں روتا ہے تو بولا۔ اماں بھیا اسی الگوجھے کے دکھ سے مر گئے۔ نہیں ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔ یہ اُس بکھت نہ سوجھا۔ کیوں ان سے بگاڑ کرتے۔ تمہیں اب وہ الگ نہ رہنے دے گا۔ کہتا ہے ہمارے لئے مر گئے تو ہم بھی ان کے بال بچوں کے لئے مر جائیں گے۔

ملیا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور دل احسان کے بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ جن سے

اُسے طعنہ اور انتقام کا خوف تھا۔ وُہ اتنے مہربان اور غمگسار ہو گئے تھے آج پہلی بار اس کا دل علیحدگی پر نادم ہوا۔ پنّا کی فراخدلی کے مقابلہ میں اپنی تنگ خیالی کتنی افسوسناک تھی

(۹)

اس واقعہ کو پانچ سال گذر گئے۔ پنّا اب بوڑھی ہو گئی تھی۔ کیدار گھر کا مالک ہے۔ مُلیا گھر کی مالکن ہے۔ کمنی اور لچھمن کی شادیاں ہو چکی ہیں —— مگر کیدار ابھی تک کنوارا ہے۔ کہتا ہے۔ مَیں شادی نہ کرونگا۔ کئی جگہوں سے بات چیت ہوئی۔ کئی سگائیاں آئیں مگر کیدار نے حامی نہ بھری۔ مہریا گھر میں آئی اور آدمی کا مزاج بدلا۔ پھر جو کچھ ہے وُہ مہریا ہے۔ ماں باپ بھائی بند سب بیگانے ہو گئے۔ کوئی اپنا ہے تو وہ مہریا ہے۔ جب بھیّا جیسے آدمی کا مزاج بدل گیا تو پھر دوسروں کی کیا گنتی۔ دو لڑکے بھگوان نے دے دیئے ہیں۔ اور کیا چاہیئے بنا بیاہ ہوئے دو لڑکے مل گئے۔ جسے اپنا سمجھو وُہ اپنا ہے۔ جسے غیر سمجھو وُہ غیر ہے۔

ایک دن پنّا نے کہا تو بیاہ نہ کرے گا تو تیرا ونش کیسے چلے گا؟

کیدار۔ میرا ونش تو چل رہا ہے۔ دونوں لڑکوں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔

پنّا۔ سمجھنے ہی پر ہے تو۔ تُو نے مُلیا کو اپنی مہریا سمجھا ہوگا۔

کیدار نے جھینپتے ہوئے کہا۔ تم تو گالی دیتی ہو۔ امّاں!

پنّا۔ گالی کیسی۔ تیری بھابی ہی تو ہے۔

کیدار۔ میرے جیسے لٹھ گنواروں کو وُہ کیوں پُوچھنے لگی۔

پنّا۔ تُو کرنے کو کہہ۔ تو میں اس سے پُوچھوں۔

کیدار۔ نہیں امّاں۔ کہیں رونے گانے نہ لگے۔ مانے گی نہیں۔

پنّا۔ تیرا من ہو تو میں باتوں میں اس سے پُوچھوں۔

کیدار۔ مَیں نہیں جانتا۔ جو چاہے کر۔

پنّا کیدار کے دل کی بات سمجھ گئی۔ لڑکے کا دل حسین مُلیا پر آیا ہوا ہے پر شرم خوف اور لحاظ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اُسی دن اُس نے مُلیا سے کہا کیا کروں؟ بہو! من کی لالسا من ہی میں رہ جاتی ہے۔ کیدار کا گھر

بھی بس جاتا تو میں نچنت ہو جاتی۔

مُلیا۔ وُہ تو کرنے کو ہی نہیں کہتے۔

پنّا۔ کہتا ہے۔ ایسی عورت ملے جو گھر میں میل سے رہے تو کروں۔

مُلیا۔ ایسی عورت کہاں ملے گی۔ کہیں ڈھونڈو۔

پنّا۔ میں نے تو ڈھونڈ لیا ہے۔

مُلیا۔ سچ کِس گاؤں کی ہے۔

پنّا۔ ابھی نہ بتاؤں گی مگر یہ جانتی ہوں کہ اس سے کیدار کی سگائی ہو جائے تو گھر بن جائے اور کیدار کی زندگی بھی سپھل ہو جائے نہ جانے لڑکی مانے گی کہ نہیں۔

مُلیا۔ مانے گی کیوں نہیں اماں۔ ایسا سندر کماؤ بَر کہاں ملا جاتا ہے اُس جنم کا کوئی سادھو مہاتما ہے نہیں تو لڑائی جھگڑے کے ڈر سے کون ایسا کرتا ہے۔ کہاں رہتی ہے؟ میں جا کر اُسے منا لاؤں گی۔

پنّا۔ بتا دوں۔ وُہ تو تُو ہی ہے۔

مُلیا شرما کر بولی۔ تم اماں جی گالی دیتی ہو۔

پنّا۔ گالی کیسی۔ دیور ہی تو ہے۔

مُلیا۔ بھلا مجھ جیسی بڑھیا کو وہ کیوں پوچھیں گے؟

پنّا۔ وہ تجھی پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ تیرے سوا کوئی عورت اُسے بھاتی ہی نہیں۔ ڈر کے مارے کہتا نہیں پر اس کے من کی بات جانتی ہوں تجھے پا کر وہ پھولا نہ سمائے گا۔

بیوگی کے غم سے مُرجھائی ہوئی مُلیا کا زرد چہرہ کنول کی طرح سُرخ ہو گیا دس سال میں جو کچھ کھویا تھا وہ ایک لمحہ میں سُود کے ساتھ مل گیا۔ وہی تازگی۔ وہی شگفتگی۔ وہی ملاحت وہی دلکشی۔

مُلیا کو ایسا معلوم ہوا۔ رگھو سامنے کھڑا اُسے دعائیں دے رہا ہے۔

تحریک

(۱)

میری کلاس میں سورج پرکاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا بلکہ یوں کہو اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے ناہموار طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ فتنہ انگیزی میں اس کی جان بستی تھی۔ مدرسوں کو بنانے اور چڑھانے، سرگرم طلبا کو ذلیل کرنے اور رُلانے میں اُسے مزا آتا تھا۔ ایسی ایسی سازشیں کرتا، ایسے ایسے پھندے ڈالتا، ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہو جاتی تھی۔ گروہ بندی میں اُسے خداداد ملکہ تھا۔ خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنا لی تھی اور اس کے زور سے سکول پر حکومت کرتا تھا۔ پرنسپل کا حکم ٹل جائے مگر کیا مجال کہ کوئی اس کے حکم سے سرمُو انحراف کر سکے۔ جیسا فعال کر دیتا تھا۔ سکول کے چپراسی اور اردلی اس سے تھر تھر کانپتے تھے انسپکٹر کا معائنہ ہونے والا تھا۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آ جائیں۔ منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائنہ کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں کر دی جائیں مگر دس بج گئے انسپکٹر صاحب آ کر بیٹھ گئے اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں۔ گیارہ بجے خود بخود سب لڑکے اس طرح نکل پڑے جیسے کوئی پنجرہ کھول دیا گیا ہو۔ انسپکٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا کہ ڈسپلن بہت خراب ہے۔ پرنسپل صاحب کی کرکری ہوئی۔ مدرسین بدنام ہوئے اور یہ ساری شرارت سورج پرکاش کی تھی مگر چند تحقیقات کی گئی۔ سورج پرکاش کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ مجھے اپنی تنظیم پر غرہ تھا۔ ٹریننگ کالج میں اس صیغہ میں میں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر یہاں میری ساری تنظیمی قابلیت میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی کام نہ کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ کئی بار مدرسوں کی میٹنگ ہوئی پر یہ عقدہ نہ

حل ہوا۔ نئے اصولِ تعلیم کے مطابق میں جورِ استاد کا قائل نہ تھا۔ پر یہاں ہم اس طریقِ عمل سے محض اس لئے محترز رہتے کہ علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے۔ سورج پرکاش کو سکول سے نکال دینے کی تجویز بھی کی۔ پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے بیس بائیس تربیت یافتہ آزمودہ کار اہلِ مدرس ایک بدمعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کر سکیں۔ یہ خیال حد درجہ شرمناک تھا۔ یوں تو سارا اسکول اس سے بیزار تھا۔ مگر سب سے پریشان میں تھا کیونکہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا۔ اور اس کی شرارتوں کا خمیازہ زیادہ تر مجھے اٹھانا پڑتا تھا۔ اسکول آتا تو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا شگوفہ کھلتا ہے۔ ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی تو اس میں سے ایک بڑا سا مینڈک نکل پڑا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا۔ کلاس میں ایک شور برپا ہو گیا۔ مگر قہر درویش برجانِ درویش . . . . سورج پرکاش کی طرف غضبناک معذوری کی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ سارا گھنٹہ پند و نصیحت میں گزر گیا اور بدمعاش سر جھکائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں سے پاس ہو کر کیونکر میرے درجہ تک آیا ہے۔ اس میں ابتدائی درجوں تک کی لیاقت بھی نہ تھی۔ آٹھویں درجہ تک آ پہنچا تھا۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے۔ پاس کیونکر ہوتا تھا۔ خدا ہی جانے۔

ایک دن میں نے غصہ سے کہا۔ "تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہو سکتے"۔
سورج پرکاش نے اطمینان اور لاپرواہی سے کہا۔ "آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں۔ میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں۔ اور اب کے بھی پاس ہوں گا۔

غیر ممکن

غیر ممکن ممکن ہو جائے گا۔

میں اس استعجاب سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ذہین سے ذہین لڑکا بھی اپنی کامیابی کا دعویٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔ معاً خیال آیا۔ یہ امتحانی پرچے اڑا لیتا ہو گا۔ ممتحنوں سے

نوکروں یا لڑکوں سے مل کر کچھ لالچ دیکر پرچے نقل کر لیتا ہوگا۔ میں نے عہد کیا، اب کے میں اس کی ایک بھی چال نہ چلنے دوں گا۔ دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہے آپ گھبرا کر نکل بھاگے گا۔

سالانہ امتحان کے موقعہ پر میں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ مگر سورج پرکاش کی کاپی دیکھی تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے دو پرچے تھے۔ دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے۔ اور ممتحنوں کے پرچے شائد اتنے اچھے نہ گئے تھے۔ مگر پاس سب پرچوں میں تھا مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچہ کا کوئی سوال بھی حل نہیں کر سکتا۔ میں اسے ثابت کر سکتا تھا مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا۔ تحریر میں اتنا فرق نہ تھا۔ جو کوئی شبہ پیدا کر سکتا۔ امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر عجلت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا تو وہ بھی چکرا گئے۔ مگر انہیں بھی دیدہ دانستہ مکھی نگلنی پڑی۔ میں شائد معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں۔ اور مدرسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردد نہ پاتا تھا گویا ایسے لڑکوں کا سکول میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ مگر میرے لئے وہ ایک ہیجان انگیز معمہ تھا۔ اگر اس کے اطوار یہی رہے تو ایک دن یا تو جیل میں ہوگا۔ یا جیل کے راستہ میں

(۲)

اسی سال میرا تبادلہ ہو گیا۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق تھی۔ پرنسپل اور دوسرے ماسٹروں سے یارانہ ہو گیا تھا۔ اور ہر قسم کی چیز ارزاں تھی۔ مگر میں اپنے تبادلہ سے خوش ہوا۔ کیونکہ سورج پرکاش سے میری گلو خلاصی ہو جائے گی۔ لڑکے مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی۔ اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے اس وقت سبھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ اتفاق سے اسی وقت میری نگاہ سورج پرکاش پر پڑی جو سب سے پیچھے کچھ نادم کھڑا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے

چلتے چلتے دو چار باتیں کر لوں۔ شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے پیش قدمی کی اور نہ اُس نے۔ حالانکہ مجھے دنوں تک اس کا افسوس رہا۔ اس کا حجاب قابلِ معافی ہے اس نے مجھے ناراضگی کے بے شمار موقع دیئے تھے۔ میرا احتراز ناقابلِ عفو تھا۔ ممکن تھا کہ اس رقت اور ندامت کے عالم میں دو چار خلوص کی باتیں اس کے دل پر اثر کر جاتیں۔ مگر انہی کھوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلی۔ لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے۔ میں کھڑکی کے باہر سے سر نکالے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے ان کے ہلتے ہوئے رومال نظر آئے۔ پھر وہ صورتیں حباب کی طرح مٹ گئیں۔ مگر ایک ننھی سی صورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے قیاس کیا وہ سورج پرکاش ہے۔ اس وقت میرا دل کسی بیتاب قیدی کی طرح نفرت، کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو توڑ توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لئے تڑپ اٹھا۔

نئے مقام کی نئی دلچسپیوں اور مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنی جانب مائل کر لیا۔ تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ پچھلے دنوں کی یاد ایک حسرت بن کر رہ گئی۔ جس میں شفقت اور لذت تو تھی۔ مگر تحریکِ عمل نہیں۔ نہ کسی کا کوئی خط آیا، نہ میں نے کوئی خط لکھا۔ شاید دنیا کا یہی دستور ہے۔ برسات کے بعد برسات کی ہریالی کتنے دنوں قائم رہتی ہے۔ عارضی صحبتوں کا یہی انجام ہے۔ خیر اتفاق سے مجھے انگلینڈ میں تکمیلِ تعلیم کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ وظیفہ ملا۔ انگلینڈ پہنچ گیا وہاں تین سال لگ گئے۔ وہاں سے لوٹا تو اپنے وطن سے بہت دور ایک کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ یہ فروغ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ خواب میں بھی میرے تخیل نے اتنی بلند پروازی نہ کی تھی۔ مگر حرصِ رفعت اب کسی بلند تر شاخ پر اپنا آشیانہ بنانا چاہتا تھا۔ وزیرِ تعلیم سے ربط ضبط پیدا کیا۔ یارانہ بڑھا۔ میں نے بھی ان کے بنگلہ سے متصل بنگلہ لیا۔ منسٹر صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ ان کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ وزیرِ تعلیم ہو کر تعلیم کے اصولی امور سے واقف نہ تھے۔ گھوڑے پر سوار وہ تھے۔ پر عنان میرے ہاتھ میں تھی اور یہ کھلا ہوا راز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفین سے میری مخالفت ہو گئی۔ مجھ پر جا و بیجا

حملے کئے جانے لگے۔ میں خلوص کے ساتھ اصلاح وفلاح کی تجویز پیش کرتا۔ اس کی مخالفت کی
جاتی۔ میں اصولاً جبری اصلاح کا مخالف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ایک انسان کو ان معاملات
میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیئے۔ جن کا تعلق ان کی ذات سے ہے بہت ممکن ہے
میں غلطی پر ہوں۔ لیکن میں جبری تعلیم کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یورپ میں اس کی ضرورت
ہے۔ ہندوستان میں نہیں۔ مادیت مغربی تہذیب کی رُوح ہے۔ وہاں کسی کام کی تحریک مالی
فوائد کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ضروریاتِ زندگی زیادہ ہیں۔ اس لئے کشمکشِ حیات بھی زیادہ
دلکش۔ والدین ضرورتوں کے غلام ہو کر بچوں کو جلد سے جلد کسبِ معاش پر مجبور کرتے ہیں بجائے
اس کے کہ وہ شراب ترک کر کے ایک شلنگ روز کی بچت کریں۔ وہ اپنے کمسن بچے کو ایک شلنگ
کی مزدوری کرنے کے لئے مجبور کرینگے۔ ہندوستان میں زندگی فقیرانہ سادگی کی حد تک پہنچی ہوئی
ہے۔ ہم اس وقت تک اپنے بچوں سے مزدوری نہیں کراتے۔ جب تک کہ حالات ہمیں مجبور نہ
کریں۔ ہم بھوکے رہینگے۔ ننگے رہیں گے لڑکوں سے مزدوری نہ کرائینگے۔ تاوقتیکہ فاقہ کشی کی نوبت نہ
پہنچے۔ غریب سے غریب اور بے نوا سے بے نوا ہندوستانی مزدور بھی تعلیم کی برکات کا قائل ہے۔
اس کے دل میں بھی تمنا ہے کہ میرا بچہ چار حرف پڑھ جائے۔ اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی رتبہ حاصل
ہوگا۔ بلکہ محض اس لئے کہ علم انسانی خصلت کا ایک زیور ہے۔ تعلیم کے فوائد اُسے سمجھانے کی ضرورت
نہیں۔ اگر وہ بے علم ہونے پر بھی اپنے بچے کو مدرسے نہیں بھیجتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی مجبوری
حاصل ہے۔ ایسی حالت میں قانوناً اسے مجبور کرنا میری نگاہ میں قرینِ انصاف نہیں اتنا ہی کافی
ہے۔ کہ آپ اُس کے فرائضِ پدری کو تشویش سے بیدار کر دیں۔ اس کے علاوہ میرے
خیال میں ابھی تعلیم کے وہ عناصر ملک میں ناکافی ہیں۔ جن سے تعلیم کی فضیلت ہے۔ نیم تعلیم یافتہ
فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ اُمید نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی اُونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں۔ زیادہ سے
زیادہ اُتنا ہی ہوگا۔ کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائیگا۔ میں اُسے "کوہ کندن و کاہ
برآوردن" کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سِن شعور میں یہ مرحلہ ایک مہینہ میں آسانی سے طے کیا

جا سکتا ہے۔ میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہم جتنا ایک مہینہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی پڑھ سکتے۔ پھر خواہ مخواہ بچوں کو مدرسے میں قید کرانے سے فائدہ؟ یوں چاہے کہو اُسے روٹیاں نہ ملتیں۔ مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدرسہ میں بند کر کے تو آپ اُسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔ اس لئے جب صوبائی کونسل میں جبری تعلیم کی تجویز پیش ہوئی تو میری تحریک کہ منسٹر صاحب نے مخالفت کی۔ گورنمنٹ تو مخالفت پر پہلے ہی آمادہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ بل مسترد ہو گیا۔ پھر کیا تھا منسٹر صاحب کی اور میری وہ لے دے شروع ہوئی کہ الامان! ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ذاتیات پر حملے کئے جانے لگے۔ میں عضو ضعیف تھا۔ اس لئے نزلہ مجھی پر گرا۔ مجھے ملک کا بدخواہ۔ ترقی کا دشمن۔ قومی غدار۔ اور گورنمنٹ کا آلہ کار بنایا گیا۔ کئی اخبارات میں آبرو ریز کارٹون بھی نکلے۔ میرے کالج میں ذرا سی بھی کوئی بات ہوتی تو کونسل میں اس پر سوالوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے ایک چپراسی کو برخاست کیا۔ ممبر اصحاب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ اعتراضات کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ منسٹر کو مجبور ہو کر اس چپراسی کو بحال کرنا پڑا۔ میں یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ شاید کوئی بھی نہ کر سکتا۔ منسٹر صاحب سے مجھے شکایت نہیں۔ وہ مجبور تھے۔ ان حالات میں کام کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ تحمّل اور ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے۔ مجھے اپنے کالج کی اندرونی تنظیم کا بھی اختیار نہیں۔ فلاں کیوں امتحان میں بھیجا گیا۔ فلاں کے عوض فلاں کو کیوں وظیفہ نہیں دیا گیا۔ فلاں پروفیسر کو فلاں کلاس کیوں نہیں دی جاتی۔ اس طرح کے بے معنی۔ مہمل اور لچر اعتراضات نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس نئی چوٹ نے تسمہ بھی الگ کر دیا۔ میں نے استعفا دے دیا۔ مخالفین کو یہ صبر کہاں کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ چلا جانے دیتے۔ میری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے منسٹر صاحب سے اتنی اُمید ضرور تھی کہ وہ کم از کم اس معاملہ میں انصاف اور حق سے کام لیں گے۔ مگر انہوں نے حق کی بجائے مصلحت کو مقدم سمجھا اور مجھے کئی سال کی

مخلصانہ رفاقت کا صلہ یہ ملا۔ کہ میری برطرفی کا نوٹس آ پہنچا۔ دُنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک مجھے نہ ہوا تھا۔ تقدیر بھی کچھ برگشتہ تھی۔ اُسی دوران میں بیوی کا انتقال ہو گیا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ شام کو دریا کنارے سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ کسل مند تھی لوٹا تو ان کی لاش ملی۔ شاید قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ اس سانحہ نے کمر توڑ دی۔ ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے ہیں۔ جو کچھ ہوا۔ بیوی کے فیض اور اثر سے ہوا وہ میری تقدیر کا ستارہ تھی۔ کتنی بلند حوصلہ تھی۔ کتنی اونچی ہمت۔ کتنا ملکوتی ایثار۔ اُس شریف میں تلخی کا نام ہی نہ تھا۔ مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ میں نے اُسے کبھی چیں بجبیں دیکھا ہو۔ ہمیشہ ہر حالت میں صابر اور خوش تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ترقی کی ایک تڑپ یا لگن اس کے ایک ایک قطرۂ خون میں بھری ہوئی تھی۔ مایوس ہونا تو جانتی ہی نہ تھی۔ میں کئی بار سخت بیمار پڑا ہوں۔ معالجوں پر بھی مایوسی کا غلبہ ہو گیا۔ پر اس کے سکون و اطمینان میں ذرہ بھر بھی تزلزل نہ ہوا۔ اُسے اعتقاد تھا۔ میں اپنے شوہر کی حیات میں مروں گی۔ اور وہی ہوا۔ میں زندگی میں اُسی کے سہارے اب تک کھڑا تھا۔ جب وہ سہارا ہی نہ رہا۔ تو زندگی کہاں رہتی کھانے اور سونے کا نام زندگی نہیں ہے۔ زندگی نام ہے۔ ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی لگن کا۔ وہ لگن غائب ہو گئی۔ میں نے دُنیا سے منہ موڑ لیا۔ اور گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن پورا کرنے کا ارادہ کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہو گیا۔ چاروں طرف اُونچے ٹیلے تھے ایک طرف گنگا بہتی تھی۔ میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا اور اس میں رہنے لگا۔

(۱۴)

مگر اہلِ دُنیا یہاں بھی مجھے دق کرنے کے لئے کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ کسی کو کوئی میموریل لکھنا ہوتا تو میرے پاس آتا۔ کبھی کبھی اخباروں کے نامہ نگاروں اور پبلشروں کے ایجنٹ بھی سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ ان کے پاس خاطر سے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا تھا۔

دلبستگی کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے گاؤں کے لڑکوں کو جمع کرکے کچھ پڑھایا کرتا تھا۔ اس کا یہاں اتنا شہرہ ہوا کہ آس پاس کے مواضعات کے نوجوان بھی آنے لگے۔

ایک روز میں اپنی کلاس پڑھا رہا تھا کہ موٹر آکر رکی۔ حلقہ کا سب انسپکٹر تحصیلدار گھوڑوں پر سوار پیچھے دوڑے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں میں اس وقت محض ایک کرتہ اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس ہیئت میں ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ مگر کپڑے منگانے کا موقع نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی موٹر سے اتر پڑے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر مجھ سے ہاتھ ملانے کے بجائے میرے پیروں کی طرف جھکے۔ اور ان پر سر رکھ دیا۔ میں کچھ ایسا سٹپٹا گیا کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں انگریزی اچھی لکھتا بولتا ہوں ولائیت ہو آیا ہوں۔ فلسفہ میں مجھے اچھا دخل ہے۔ تقریر بھی خوب کرلیتا ہوں مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدس کے قابل نہیں۔ وہ درجہ تو عارف اور کامل کو ہی ہے اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات تھی۔ حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں ابھی اسی حیرت میں پڑا ہوا تھا۔ کہ اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں"

اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ صورت مانوس معلوم ہوئی ایسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔

دفعتہً حافظ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بولا آپ کا نام پرکاش تو نہیں ہے؟

"جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں۔ مگر آپ نے خوب پہچانا۔ مجھے امید نہ تھی۔ میں سنہ ۱۹۱۶ء میں اس سکول میں تھا۔ بارہ تیرہ سال ہو گئے۔

سعدنج پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں۔ مگر لڑکے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

میں نے اسی مذاق کے انداز سے جواب دیا۔ تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے۔

سورج پرکاش۔ انہیں خطاؤں کی معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا۔ جب آپ انگلینڈ گئے۔ تب میں نے آپ کے لئے مبارکباد لکھی۔ مگر بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب آپ پرنسپل ہوئے۔ اس وقت میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا۔ ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ وہاں میں آپ کے مضامین اخبارات میں پڑھتا تھا۔ جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ آپ نے استعفا دیدیا اور کہیں دیہات میں چلے گئے ہیں۔ اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوا۔ مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آج باتوں ہی باتوں کسی زمیندار نے آپ کا ذکر کیا۔ آپ کا نام تو اسے معلوم نہ تھا۔ مگر اس نے جو حلیہ بیان کیا۔ اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا۔ ڈاکخانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تحقیق ہو گئی۔ دفعتاً چلا آرہا ہوں۔ آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے۔ اس کوردیہہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی ہے۔ ابھی تو آپ کی عمر ۲۶ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہاں ریٹ کا زمانہ تو ۶۰ کے بعد آتا ہے۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوئی۔ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔ میں اسے اپنے جھونپڑے میں لایا اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کہانی سنائی۔

سورج پرکاش نے کہا۔ "تو یہ کہئے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بیوفائی کا شکار ہوئے میرا تجربہ تو ابھی بہت ہی مختصر ہے مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے۔ جہاں دیکھئے وہاں خودغرضی۔ بفنڈر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھونگا۔ یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا۔"

میں نے جواب دیا۔ بھئی ان کی کوئی خطا نہیں۔ ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انہوں نے کیا۔ مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا مل گئی ہے۔ اور اس کے لئے میں ان کا مشکور ہوں تصنع نہیں۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ یہاں مجھے جتنا سکون اور اطمینان ہے۔ اتنا کبھی نہ تھا۔

اس گوشۂ قناعت میں مجھے حقائق زندگی کا وہ علم ہوا جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر امریکہ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کر کے بھی میں اپنی خود پرستی کا ازالہ نہ کر سکا۔ بلکہ یہ مرض روز بروز زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا۔ آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقف کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ثروت کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کی زندگیاں ہی زینوں کا کام دیتی ہیں۔ آپ انہیں کچلے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں انسانیت شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں درندوں کے بیچ میں تھا اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہو جاتی تھیں۔ یہاں میں اپنے چاروں طرف خلوص اور سادگی دیکھتا ہوں۔ میرے پاس جو لوگ آتے ہیں۔ کوئی کمینہ غرض لے کر نہیں آتے۔ اور نہ میری خدمات میں صلہ یا ستائش کی تمنا ہے۔ میں بھی کسی کے پاس جاتا ہوں تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا مجھے یہاں کے در و دیوار اور برگ و بار میں بھی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے"

یہ کہہ کر میں نے سورج پرکاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ مگر شرارت آمیز تبسم کی جگہ پشیمانی کا رنگ تھا۔ مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا۔ شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے۔ وہ مجھ سے اپنے سعیِ جمیل کی داد چاہتا تھا۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک صاحب ثروت کے روبرو ثروت و جاہ کی مذمت زیبا نہیں۔ میں نے فوراً سلسلۂ تقریر بدل کر کہا: "مگر تم اپنا حال تو کہو۔ تمہاری یہ کایا پلٹ کیونکر ہوئی تمہاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکایک یہ انقلاب کیسے ہوا۔ کسی فقیر کے سوا اور کوئی طاقت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی"

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا "آپ کی دعا تھی"

"دعا نہیں بددعا ہو سکتی تھی۔"

"ابھی اس حد تک دنیا سے بیزار نہیں ہوا ہوں"

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پرکاش نے اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔

آپ کے چلے آنے کے بعد کئی روز بعد میرا ماموں زاد بھائی سکول میں داخل ہُوا۔ اسکی عمر آٹھ نو سال سے زائد نہ تھی۔ پرنسپل صاحب اُسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے۔ اور نہ ماموں صاحب اس کے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے۔ انہیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجئے۔ پرنسپل صاحب اس پر راضی نہ ہوئے۔ کہنے لگے یہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ میں بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے اسی دن ہوسٹل چھوڑ دیا اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لے کر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ زائد خرچ کا بار ماموں صاحب نے لیا۔ لڑکے کا نام موہن تھا۔ اس کی ماں کئی سال پہلے مر چکی تھی۔ اتنا دُبلا پتلا کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا۔ کبھی بخار آتا آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی رہتی تھی۔ سرِشام سو جاتا۔ اور اسے کھانا کھلانے کے لئے مجھے اسکی منتیں کرنی پڑتیں۔ دن چڑھے تک سوتا رہتا۔ اور جب تک میں گود میں اُٹھا کر بٹھا نہ دیتا۔ اُٹھنے کا نام نہ لیتا۔ رات کو چونک پڑتا ——— اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میری چارپائی پر آجاتا اور میرے گلے سے لپٹ کر سوتا۔ مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں مجھے اس سے اتنا اُنس ہو گیا۔ میں جو نو بجے سو کر اُٹھا کرتا تھا۔ تڑکے اُٹھ بیٹھتا اور اس کے لئے دودھ گرم کرتا پھر اُسے اُٹھا کر ہاتھ مُنہ دُھلاتا اور اسکی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کرانے لے جاتا۔ میں جو کبھی کتاب لے کر نہ بیٹھتا تھا۔ اُسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس کیونکر ہو گیا۔ اس کا اب تک مجھے تعجب ہے۔ اُسے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی تو میری جان ناخن میں سما جاتی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس دوڑتا۔ دوائیں لاتا۔ اور موہن کی خوشامد کر کے اُسے دوا پلاتا۔ ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے ماموں صاحب اُسے میرے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بچارا بے ماں کا لڑکا ہے۔ میرے بدمعاش دوستوں میں کوئی اُسے چڑاتا یا چھیڑتا تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ کئی لڑکے تو مجھے بوڑھی دایہ کہہ کر چڑاتے تھے۔ پر میں ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ میں اس کے سامنے کوئی بیہودہ حرکت نہ کرتا تھا۔ ایک بھی

ناشائستہ لفظ مُنہ سے نہ نکلتا۔ یہ خیال ہوتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائے۔ مَیں اُسکے سامنے اس طرح رہنا چاہتا تھا کہ وُہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے اور اسکے لئے لازمی تھا کہ پہلے مَیں اپنی اصلاح کر لوں۔ وُہ نو بجے سو کر اُٹھتا۔ وہ بارہ بجے تک سیر گشت کرتا۔ وُہ نئی نئی شرارتوں کے منصوبے باندھتا۔ وُہ ماسٹروں کی آنکھ بچا کر سکول سے اُڑ جاتا۔ آپ ہی آپ جاتا رہا۔ صحت اور اخلاق کے آئین کا بَیر دشمن تھا۔ پر اب مجھ سے بڑھ کر اُن کا پابند دوسرا نہ تھا۔ مَیں ایشور کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ مگر اب پکا خدا دوست ہو گیا تھا۔ وُہ بڑی سادگی سے پُوچھتا تھا۔ "پرماتما سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہونگے؟" اس سوال کا مذاق اُڑانا میرے لئے غیر ممکن تھا مَیں کہتا۔ "ہاں پرماتما تمہارے ہمارے سب کے پاس رہتے ہیں۔ اور ہماری حفاظت کرتے ہیں۔" اس کا چہرہ نورانی مسرت سے چمک اُٹھتا تھا۔ شاید وہ پرماتما کے وجود کو محسوس کرنے لگتا تھا۔ ماسٹر صاحب یقین مانئے۔ سال بھر میں ہی موہن کچھ سے کچھ ہو گیا۔ وہ منحنی غریب صورت۔ کاہل بیخبر لڑکا اب توانا، شگفتہ رُو۔ چاق و چُست اور بشاش ہو گیا۔ ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اُسے دیکھ کر حیرت میں آ گئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

"بیٹا تم نے اِسے جلا دیا۔ ورنہ میں تو مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا صلہ تمہیں ایشور دینگے۔ اس کی ماں جنت میں بیٹھی ہوئی تمہیں دعائیں دے رہی ہے۔"

سُورج پرکاش کی آنکھیں اس وقت بھی آبگوں ہو گئی تھیں۔

مَیں نے پُوچھا۔ "موہن بھی تمہیں بہت پیار کرتا ہوگا۔"

سُورج پرکاش کی آبگوں آنکھوں میں ایک حسرتناک مسرت جلوہ افروز ہوئی۔ بولا!

"جناب! وُہ مجھے ایک منٹ کے لئے بھی نہ چھوڑتا تھا۔ میرے ساتھ کھاتا، میرے ساتھ بیٹھتا میرے ساتھ سوتا۔ میں ہی اس کا سب کچھ تھا۔ افسوس وُہ آج اس دُنیا میں نہیں ہے مگر میں اُسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں۔ مَیں جو کچھ ہوں۔ اسی کا بنایا ہوا ہوں۔ اگر وُہ فرشتۂ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج مَیں کسی جیل میں پڑا ہوتا۔ ایک دن مَیں نے کہہ دیا۔ "اگر تم روز نہانہ

لیا کرونگا تو میں تم سے نہ بولوں گا۔ نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چُراتا تھا۔ میری اس دھمکی کا یہ اثر ہُوا کہ وہ روزانہ علی الصباح نہانے لگا۔ کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا۔ دیکھتا رہتا تھا کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں۔ ایک روز میں چند احباب کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلا گیا۔ تاکید کر گیا تھا کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا۔ تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا، "تم سوئے نہیں؟" بولا "نیند نہیں آئی۔" اس دن سے میں نے تھیٹر جانے کا نام نہ لیا۔ بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے۔ دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب۔ جو ماں کی گود کے سامنے دُنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا مُنہ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اس کی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی اس سے چمٹ جاتی ہے۔ وہی حال موہن کا تھا۔ وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا کہ اس کی نازک بیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا اور مجھے استوار کر دیا۔ اس کی ذات کا قصہ نہایت دردناک ہے۔ میرے دل پر اس کا غم اس وقت بھی تازہ ہے۔ اور مجھ میں اتنا ضبط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں۔ وہ میرے ساتھ تین سال رہا۔ شاید غیب سے میری ہدایت کے لئے جو مشعل عطا ہُوا تھا وہ مقصد پُورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس ننھے سے دل میں کیا کیا ارمان بھرے ہوئے تھے۔ بی اے پاس کرنا۔ ایم اے پاس کرنا۔ وظیفہ پانا۔ ولائیت جانا۔ وہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا —— یہی اس کے زندگی کے خواب تھے۔ جو مرگِ بے ہنگام نے پریشان کر دیئے۔

گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ دو تعطیلوں میں موہن میرے ساتھ رہا تھا۔ ماموں صاحب کے اصرار کرنے پر بھی گھر نہ گیا۔ تیسری تعطیل میں میری کالج پارٹی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا اور مجھے اس کا کپتان بنایا۔ کشمیر کی سیاحت کی تمنا مدت سے تھی۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ موہن کو ماموں صاحب کے پاس بھیجکر میں کشمیر چلا گیا۔ دو ماہ کے بعد لوٹا تو معلوم ہُوا کہ موہن بیمار ہے۔ کشمیر میں مجھے بار بار

موہن کی یاد آتی تھی۔ اور جی چاہتا تھا۔ لوٹ جاؤں مجھے اس سے اتنی محبت ہے۔ اس کا اندازہ مجھے کشمیر جا کر ہوا۔ مگر احباب سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ اس کی بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد چہرے پر مسرت کی زندگی کی جھلک پڑی۔ میں دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ اسکی آنکھوں میں کچھ وہ دور نظری اور چہرے پر وہ روحانیت تھی جو منڈلاتی ہوئی موت کی خبر دیتی تھی۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے پوچھا: "تمہاری کیا حالت ہے موہن! ــــ دو ہی مہینے میں یہ نوبت پہنچ گئی۔"

موہن نے معصوم تبسم کے ساتھ کہا۔ "آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے۔ میں آسمان کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔"

مگر اس قصۂ غم کو بیان کر کے میں رونا اور رُلانا نہیں چاہتا۔ میرے چلے جانے کے بعد موہن اسی طرح پڑھنے لگا۔ جیسے تپسیا کر رہا ہو۔ اسے یہ ضبط بیٹھ گیا کہ سال بھر کا کورس دو ماہ میں ختم کرے۔ اور جب مجھ سے ملاقات ہو۔ تو اپنی کارگذاری کی داد وصول کرے۔ اس اشتیاق نے محویت کی صورت اختیار کر لی۔ میں کس طرح اس کی پیٹھ ٹھونکوں گا۔ شاباشی دوں گا۔ اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کروں گا۔ یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور انہماک کے ساتھ اس پر غالب آ گئے۔ ماموں صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس کی تفریح کی فکر کریں۔ شاید اسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے۔ ایسا کون باپ ہے۔ جو لڑکے کے شوقِ طلب میں مخل ہو۔ موہن کو کھیلتے دیکھ کر وہ ضرور ڈانٹتے۔ "کتاب لے کر کیوں نہیں بیٹھتے" پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہتے۔ کسی باپ نے بھلا لڑکے کو پڑھنے کے لئے نہیں ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کی نازک صحت یہ ریاضتِ شاقہ برداشت نہ کر سکی۔ اُسے ہلکا بخار آنے لگا۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کئی اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہو جاتا تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا۔ اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکروں سے پوچھتا: "بھیا کا خط آیا؟ وہ کب آئیں گے؟" اس وقت اس کے سوا اُسے کوئی دوسری تمنا نہ تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیرِ کشمیر اتنی

ہنگی پڑے گی تو مَیں اس کا نام بھی نہ لیتا۔ ہم نے اُسے سنبھالنے کی حتی الامکان بڑی کوشش کی مگر بخار ٹائیفائڈ تھا۔ اس کی جان لے کر ہی اُترا۔ پہلی بار مَیں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریک عمل کرتے تھے۔ اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا۔ اُس پر عمل کر کے مجھے یہ مسرت ہوئی ہے کہ شاید اس کی معصوم رُوح مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔ یہی تحریک تھی۔ جس نے ایم اے سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا۔ ورنہ میں آج بھی وہی نالائق گستاخ اور غبی سُورج پرکاش ہوتا۔ جس کی صورت سے بھی آپ بیزار تھے۔"

اس دن سے میں کئی بار سُورج پرکاش سے مل چکا ہوں۔ وہ جب اس گرد و نواح میں آجاتا ہے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ موہن اب بھی اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے انسانی فطرت کا یہ ایک ایسا معمہ ہے۔ جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

تمام شد